بسم اللہ الرحمن الرحیم

# ”جدید عربی: عربی حروف میں فرنگی زبان“ کے ”جائزہ“ کا ”جائزہ“

﴿دوسری قسط اور تیسری قسط﴾

محمد ذیشان مئوی قاسمی
فاضل دارالعلوم دیوبند

# عرض راقم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمده ونصلي على رسوله الكريم، أما بعد،

بڑوں کے تعلق سے میرا بھی مبنی بر اعتدال موقف وہی ہے جو خود ہمارے بڑوں کا رہا ہے کہ ”جس طرح بشری تقاضوں کے پیشِ نظر وہ دین و دیانت کے باب میں خطاؤوں سے معصوم نہیں تھے“ (؛اس لیے کہ عصمت صرف انبیاء کے لیے ثابت ہے اور حفاظت صحابہ کی خصوصیت ہے) اسی طرح لسان وادب کے میدان میں بھی ان کا غلطیوں سے پاک نہ ہونا ذرا بھی تعجب خیز نہیں؛ لہٰذا حد ادب میں رہ کر ہر دو مواقع پر صحیح دلائل وشواہد کی روشنی میں ان سے اختلاف کیا جاسکتا ہے“۔

اگر حضرت مولانا نوری صاحب اس مبنی بر اعتدال موقف کو سامنے رکھتے اور مؤلف کی صرف اتنی بات سے اختلاف کرتے کہ ”آپ کا اسلوب کچھ تیز ہوگیا ہے آپ اسے نرم بنائیں“ تو راقم بھی کچھ نہ کہتا اور نہ کہنے کی ضرورت ہوتی؛ لیکن نوری صاحب نے جب جوش عقیدت میں فرنگی تراکیب وتعبیرات کی بھی توجیہات بلکہ بارد تاویلات کرنا شروع کردی تو راقم کو بھی محض ”اظہار حق اور ازالہ شبہات کے جذبے کے پیش نظر“ کچھ خامہ فرسائی کرنی پڑی:

نہ صدمے ہم کو تم دیتے، نہ ہم فریادیوں کرتے
نہ کھلتے راز سربستہ، نہ یوں رسوائیاں ہوتیں

میرے عربی ادب کے اساتذہ اور اساتذہ کے اساتذہ، کے ساتھ ادب کا تقاضہ تو شاید یہ تھا کہ میں جدید عربی کے خلاف اتنا طویل مضمون تو کجا ایک سطر؛ بلکہ ایک حرف بھی نہ لکھتا؛ مگر مسئلہ چونکہ قرآن وحدیث کی عربی اور شعار دین کی حفاظت کا تھا؛ لہذا بہت پہلے ایک عالم ربانی کی زبانی بارہا سنا ہوا یہ مقولہ سماعتوں میں گونج گیا کہ **«علم کا حق علماء کے حق سے مقدم ہے»** بس پھر کیا تھا؛ میرے قلم کو بھی ”احقاق حق کا جوش“ آگیا اور وہ اقبال مرحوم کا یہ شعر گنگناتے ہوئے پچاسوں صفحات پر

رقص کرگیا کہ:

کہتا ہوں وہی بات، سمجھتا ہوں جسے حق
نے ابلۂ مسجد ہوں، نے تہذیب کا فرزند
اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں، بیگانے بھی ناخوش
میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

فقط
احقرالوریٰ
محمد ذیشان مئوی قاسمی عفی عنہ
۲۵/شعبان ۱۴۴۷ھ، بروز: جمعہ

## (دوسری قسط)

# کچھ بنیادی شبہات اور ان کے شافی جوابات

حضرت مولانا نوری صاحب نے دوسری قسط میں چونکہ کچھ اصولی باتیں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ تو ہم بھی اس کا جواب اصولی ہی دیتے ہیں۔ حضرت مولانا لغوی اضافات کے تعلق سے الفاظ مولدہ و دخیلہ کی پوری تفصیل و تاریخ بیان کرنے کے بعد اخیر میں نتیجہ نکالتے ہیں کہ "الفاظ معربہ یا دخیلہ کا رشتہ زبان و ادب سے قدیم ہے۔ عصر احتجاج کے بعد بھی عصر عباسی اور بعد کے ادوار میں عربی میں کلمات دخیلہ کا استعمال ہوا... یہ الفاظ اور کلمات نہ عربی زبان کے لیے سازش ہیں اور نہ شرمندگی کا باعث ...(نوری جائزہ:۲/۱۵) پھر مؤلف نے القاموس الوحید کی جن مثالوں پر اعتراض کیا تھا ان سب کو جائزہ کے اخیر میں ایک ساتھ ذکر کر کے اجمالی تبصرہ کرتے ہیں کہ:

"...اگر دخیل یا معرب کلمات کی وضع اور معنوی تخصیص، یا تعمیم کی وجہ سے عربی زبان کو غیر معیاری قرار دیا جائے اور لغت کی کتابوں کی اعتباریت پر سوال کھڑا کیا جائے تو اس سوال کی زد میں صرف دور جدید کی عربی نہیں آئے گی؛ بلکہ زمان سابق کی بھی عربی زبان آئے گی"۔ (نوری جائزہ۱۷,۲/۱۸)

## نقطۂ اختلاف

**راقم کہتا ہے:** رد و تنقید کا مضمون ہو، یا مباحثہ و مناظرہ کی مجلس، نقطۂ اختلاف اور موضوع بحث کا متعیّن ہونا بے حد ضروری ہے۔ ورنہ بدوں اس کے فریقین اپنی اپنی ہی کہے جاتے ہیں۔

حضرت مولانا نوری صاحب جن باتوں پر اصولی وضاحتیں پیش کر رہے ہیں ان باتوں پر مؤلف کا نقد و انکار نہیں؛ بلکہ وہ اس کے مقر ہیں اور مؤلف کا جن باتوں پر در حقیقت نقد و اعتراض

ہے اس پر قلمی گل افشانیاں ندارد ہیں۔

مولانا نوری صاحب جائزہ کی دوسری قسط میں مطلق لغوی اضافات وتوسیعات پر اصولی وضاحت وتفصیل پیش کررہے ہیں جبکہ مؤلف کا بالواسطہ اور غیور اہل زبان عرب علماء کا براہ راست اصل نقدواعتراض مقیّد لغوی اضافات وتوسیعات پر ہے اور وہ قید ہے:

"عربی میں متبادل فصیح الفاظ کے موجود ہونے کے باوجود، بلاضرورت، محض فرنگیت کی تقلید و اتباع میں، عربی حروف و مفردات کو، فرنگی جمل وتراکیب اور فرنگی قالب وسانچے میں ڈھال دینا"۔

# مقیّد اضافہ وتوسیع اور اس کی ضرورت

اس اجمال کی قدرے تفصیل یہ ہے کہ: "توسیع ہر زبان میں ہوتی ہے جب نئی نئی ایجادات سامنے آتی ہیں تو ان کے لیے نئے نئے اسماء وضع کیے جاتے ہیں۔ زبان کی یہ توسیع ہر زمان و مکان میں ہوتی رہی ہے اور ہوتی رہے گی۔ عربی زبان میں بھی توسیع ہوئی ہے۔ نئی نئی ایجادات کے لیے اشتقاق، نحت، یا وضع، یا تعریب کے طریقے سے نئے نئے اسماء وضع کیے گئے۔ مختلف اسلامی علوم و فنون مثلاً منطق، فلسفہ، فقہ اور حدیث وغیرہ کی اصطلاحات وضع کی گئیں۔ اسی کو توسیع کہتے ہیں۔ اس توسیع کا کوئی انکار نہیں کرتا۔ (کتاب مؤلف ص ۴۱۴۔ بحوالہ: العرنجیه لاحمد الغامدی ص ۷۳. البیان و التبیین للجاحظ، ج۱/۱۳۱. الفصحی لغة القرآن، لانور الجندی ص ۱۴. نحو إتقان الکتابه باللغة العربیة، لمحمد مکی الحسنی الجزائری ص ۱۵).

# توسیع کے نام پر تضییق

"لیکن یہاں توسیع کے نام پر بڑی غلط فہمی پھیلائی گئی ہے۔ دراصل عربی زبان ہی دنیا کی سب سے زیادہ وسیع ترین زبان تھی اور فرنگی زبان اس کے مقابلے میں بہت تنگ زبان تھی۔ دشمنوں نے عربی زبان کی وسعت کو ختم کر کے اس کو فرنگی زبان کے سائز کے مطابق تنگ زبان بنا کر اس کو فرنگی زبان کے قالب میں ڈھال دیا اور یہ غلط فہمی پھیلا دی کہ عربی زبان کی توسیع ہوئی ہے"۔ اور توسیع کا جھانسہ دے کر الٹا تضییق کر دی۔ جس کے دو طریقے اپنائے۔

## پہلا طریقہ:

تو یہ کہ "ایک مفہوم کے لیے عربی میں مختلف مواقع کے اعتبار سے مختلف الفاظ تھے؛ مگر ان میں سے جو لفظ فرنگی زبان کے موافق ہوا سے رائج کر دیا اور باقی سب الفاظ کو ترک کر دیا۔ (کتاب مؤلف ص ۴۱۵۔ بحوالہ: العرنجیہ ص: ۷۷، وص: ۱۰۷)۔

## متواضع

مثلاً "عربی میں «متواضع» کے معنی ہیں: "فروتنی اور انکساری کرنے والا آدمی" جو متکبر کے برعکس ہے۔ اس معنی میں فرنچ کا لفظ "humble or modest" آتا ہے۔ پھر فرنچ نے اس لفظ کو ہر حقیر اور معمولی چیز کے معنی میں استعمال کیا۔ پھر جدید عربی والوں نے بھی فرنچ کی تقلید میں ہر حقیر و معمولی چیز کے لیے "متواضع" کو رائج کر دیا، حالانکہ حقیر و معمولی چیز کے لیے عربی میں متعدّد صیغۂ صفت ہیں مثلاً: یسیر /زهید/قلیل /هین/ حقیر /خامل/وسط. مگر جدید عربی والوں نے عربی الفاظ کو چھوڑ کر غلط لفظ" متواضع" کو ہی مشہور کر دیا۔ جیسے: كانت بدايته متواضعة/هدية متواضعة/أثاث متواضع /مدينة متواضعة/ جهد متواضع/أنا آتي من

خلفية متواضعة۔ (کتاب مؤلف ص ۱۷۲۔ بحوالہ: تذکرۃ الکاتب ص ١٤٦. و معجمیات للدکتور ابراھیم السامرائی ص ١٣٧. العرنجیة ص ٩٤. ) یہ سب فرنگی تعبیرات کے لفظی ترجمے ہیں (کتاب مؤلف ص ۱۷۲ بحوالہ: العرنجیہ للغامدی)۔

## دوسرا طریقہ:

دنیا کی ہر زبان میں توسیع ہوتی ہے؛ مگر زبان کے اصل اسالیب و تراکیب کو برقرار رکھ کر توسیع ہوتی ہے؛ لیکن یہاں توسیع کے نام پر عربی زبان کی تراکیب بدل دی گئیں۔ اسالیب و محاورات بدل دیے گئے۔ فصیح کو شاذ سے بدل دیا گیا۔ فرنگی و انگریزی الفاظ کی بہتات کر دی گئی۔ الفاظ کے معانی بدل دیے گئے۔ صلات بدل دیے گئے۔ اصطلاحات بدل دی گئیں؛ بلکہ صرفی قواعد تک بدل دیے گئے" اور یہ صرف لفاظی نہیں ہے؛ بلکہ ان سب باتوں کی ہزاروں مثالیں غیور اہل زبان عرب علماء کی کتابوں میں مذکور ہیں جن میں سے خود مؤلف کی کتاب میں:

"فرنگی تراکیب کی ۲۸۰ مثالیں آئی ہیں۔

فرنگی محاورات کی ۲۷ مثالیں آئی ہیں۔

فصیح کے خاتمے اور شاذ و غلط کی ترویج کی ۹۴ مثالیں آئی ہیں۔

فرنگی و انگریزی الفاظ کی بہتات کی ۱۵۲ مثالیں آئی ہیں۔

لغوی و صرفی تحریفات کی ۱۶۴ مثالیں آئی ہیں۔

نحوی تحریفات کی ۹۳ مثالیں آئی ہیں۔

صلات کی تحریفات کی ۹۲ مثالیں آئی ہیں۔

اصطلاحات کی تحریفات کی ۵۳ مثالیں آئی ہیں۔

یعنی فرنگی تراکیب اور لسانی تحریفات کی کل ایک ہزار (۱۰۰۰)

مثالیں (صرف مؤلف کی) اس کتاب میں آچکی ہیں اور جن مراجع سے یہ مثالیں اخذ کی ہیں

ان میں ان سے بہت زیادہ اور بھی مثالیں درج ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عربی زبان کا اپنا کچھ نہیں بچا۔ پوری کی پوری عربی زبان مسخ ہوگئی ہے اور عربی حروف میں فرنگی زبان بنا کر اسی کو "جدید عربی" کا نام دے دیا گیا ہے تو کیا ہم اس کو زبان کی توسیع کہہ سکتے ہیں؟" (کتاب مؤلف ص ۴۱۷)۔

**الغرض:**

نقد و اعتراض اس احداث و تولید اور اضافہ و توسیع پر نہیں ہے جو حسب ضرورت ہو، غیور اہل زبان عرب علماء کی نگرانی میں ہو اور عربی زبان کے مزاج و مذاق کے مطابق ہو؛ بلکہ اس احداث و تولید اور اضافہ و توسیع پر ہے جو بلا ضرورت ہو، مستشرقین اور ان کے مقلدین کی نگرانی میں ہو، عربی زبان کے مزاج و مذاق سے ہٹ کر ہو اور فرنگی قالب و سانچے میں ڈھلا ہوا ہو۔

# فرنگی سازش
# اور اس پر شاہد کتب

**شبہ:** یہ سب کچھ سازش کے تحت ہوا، یا ہو رہا ہے، اس کی کیا دلیل ہے؟

**جواب:** اس کی دلیل ان تمام غیور اہل زبان عرب علماء کی ہزاروں صفحات پر پھیلی وہ سو سے زائد کتابیں ہیں جن کی مراجعت سے مؤلف نے یہ کتاب تیار کی ہے۔ ان سب میں مستشرقین کی اس سازش کو آشکارا کیا گیا ہے۔ اور "یہ سب علماء، قدیم عربی، جدید عربی، عامی زبان، نیز انگریزی اور فرانسیسی سبھی زبانوں کو اچھی طرح جانتے ہیں اور ان کے نشیب و فراز سے واقف ہیں۔ یہ تمام علماء ڈنکے کی چوٹ پر کہہ رہے ہیں کہ "جدید عربی" عربی کی توسیع نہیں؛ بلکہ تحریف ہے، مسخ ہے، فرنگی ہے، سازش کا نتیجہ ہے، مستشرقین کی پیداوار ہے۔

چند ایسی کتابوں کے نام (جن کے عنوان سے ہی معنون ظاہر ہے) بطور مثال ملاحظہ ہوں:

(١) "المؤامرة الغربية على اللغة العربية"

(٢) "اللغة العربية: ميزاتها، وكيد الأعداء لها"،

(٣) "العدوان على العربية عدوان على الإسلام"،

(٤) تعابير أوروبية في العربية الحديثة،

(٥) أثر اللغات الإفرنجية في العربية العصرية،

(٦) إحذروا الأساليب الحديثة،

(٧) تاريخ الدعوة إلى العامية وآثارها في مصر.

امید ہے کہ محترم قارئین کو چند صفحات کی ان بنیادی باتوں سے محترم تبصرہ نگار کی دوسری قسط سے پیدا ہونے والے بنیادی خلجانات کا مکمل اور شافی جواب حاصل جائے گا۔ لہذا اس دوسری قسط میں ہم اتنی ہی باتوں پر اکتفا کرتے ہیں۔

وما علينا إلا البلاغ

# (تیسری قسط)

# کچھ بنیادی شبہات
# اور ان کے شافی جوابات

تیسری قسط کے شروع میں بھی محترم تبصرہ نگار نے لغوی تنقید و تقویم کے بارے میں کچھ اصولی باتیں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ جس کا ماحصل یہ ہے کہ "لغوی تنقید یا تقویم علم اللغۃ کی ایک مستقل شاخ ہے اور اس باب میں ... صحیح نقطۂ نظر کی وضاحت یہ ہے کہ جدید تعبیرات اور کلمات میں سے وہی تعبیرات اور کلمات قابل قبول ہوں گے جو لغوی تولید و احداث کے اصولوں پر قائم ہوں" (نوری جائزہ: ۳/۳)۔

## محل نزاع

**راقم کہتا ہے:** بحث اس سے نہیں ہے کہ عصر حاضر کی جدید عربی میں جدید تعبیرات اور کلمات میں لغوی تولید و احداث کے اصولوں کی پاسداری ہے یا نہیں؟ بلکہ بحث تو اس سے ہے کہ "ضرورت نہ ہونے کے باوجود، مستشرقین نے ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت، اور ان کے عرب مقلدین نے نادانستہ طور پر محض فرنگیت سے متأثر و مرعوب ہوکر، فصیح عربی متبادل کو چھوڑ کر، عربی حروف و مفردات کو فرنگی جمل و تراکیب اور فرنگی قالب و سانچے میں ڈھال دیا ہے اور ہنوز ڈھال رہے ہیں"

اب چاہے یہ ڈھالنا لغوی تولید و احداث کے اصولوں پر ہو رہا ہو، یا نہ ہو رہا ہو، کیا فرق پڑتا ہے؟ قدیم عربی تو دونوں ہی صورتوں میں مسخ و محرف ہو کر رہے گی۔ "سیب چاقو پر گرے، یا چاقو سیب پر، کٹنا تو آخر سیب ہی کو ہے"۔

آپ ہی فرمادیں کہ کیابلاضرورت صرف لغوی تولید واحداث کے اصولوں کالحاظ کرتے ہوئے پوری عربی زبان کوفرنگی زبان بنانادرست ہے ؟۔

## شبہ اور جواب

ممکن ہے کہ آپ کو یہ شبہ ہوکہ "بلاضرورت "کی قید درست نہیں ؛بلکہ ضرورت توتھی۔

توآپ اس ضرورت کو ثابت کریں! جبکہ ہم نے بلاضرورت کا دعوی کیاہے توہم نے اس کے دلائل بھی فراہم کردیے ہیں اور وہ دلائل وہ ایک ہزار مثالیں ہیں جو مؤلف کی کتاب میں آچکی ہیں جس کی ہر مثال حقیقت کا یہ آئینہ آپ کے سامنے کردیتی ہے کہ "ہر مفہوم میں عربی کے درجنوں الفاظ وتعبیرات ہیں ؛لیکن ان کوصرف اس لیے چھوڑ دیاگیاکہ وہ فرنگی قالب سے میل نہیں کھارہے تھے اور ان کی جگہ ان الفاظ وتعبیرات کورائج کردیاگیاجو فرنگی وانگریزی قالب کے موافق تھے اور لفظی ترجمے کے قابل تھے۔(ص ۳۱۳)

اسی طرح فرنگی تراکیب کی مثالوں میں "آپ ہر فرنگی ترکیب میں دیکھیں گے کہ اس ترکیب کی عربی زبان میں کوئی ضرورت نہیں تھی عربی میں اس کی متبادل کئی کئی تراکیب پہلے سے موجود ہیں؛ لیکن صرف انگریزکی اتباع کے لیے اور عربی زبان کوفرنگی قالب میں ڈھالنے کے لیے ان فرنگی تراکیب کوعربی میں ٹھونس دیاگیا(ص ۱۶۸)۔

## شبہ ضرورت

## اور اس کاجواب

اور اگرآپ ضرورت کواس طرح ثابت کریں کہ: "آج بہت سی چیزیں وجود میں آگئی ہیں۔ ان نئی چیزوں کے لیے الفاظ کو وضع کرکے عربی زبان کی توسیع کرناضروری تھا۔ جدید عربی اسی توسیع کانام ہے"۔

تو اس کا جواب ہم پہلے بھی دے چکے ہیں کہ "توسیع ہر زبان میں ہوتی ہے۔ جب نئی نئی ایجادات سامنے آتی ہیں۔ تو ان کے لیے نئے نئے اسماء وضع کیے جاتے ہیں۔ زبان کی یہ توسیع ہر زمان و مکان میں ہوتی رہی ہے اور ہوتی رہے گی۔ عربی زبان میں بھی توسیع ہوئی ہے۔ نئی نئی ایجادات کے لیے اشتقاق، نحت، وضع یا تعریب کے طریقے سے نئے نئے اسماء وضع کیے گئے ہیں۔ مختلف اسلامی علوم و فنون مثلاً منطق، فلسفہ، فقہ اور حدیث وغیرہ کی اصطلاحات وضع کی گئی ہیں۔ اسی کو توسیع کہتے ہیں۔ اس توسیع کا کوئی انکار نہیں کرتا۔ (کتاب مؤلف ص ۴۱۴)

لیکن یہاں توسیع کے نام پر بڑی غلط فہمی پھیلائی گئی ہے " (أیضًا) اور توسیع کا جھانسہ دے کر الٹا تضییق کر دی گئی ہے جس کے دو طریقے اپنائے گئے جن کی وضاحت دوسری قسط میں آچکی ہے۔

## تیسرا شبہ

تیسرا شبہ جو آپ ہماری بات کسی حد تک تسلیم کر لینے کے بعد کر سکتے ہیں وہ یہ ہو سکتا ہے کہ:

"ممکن ہے کہ انگریزی و فرانسیسی زبانوں کی صرف کچھ ترکیبیں اور کچھ محاورے اور لب و لہجے جدید عربی میں داخل ہوئے ہوں؛ لیکن اس کو پوری عربی زبان کا مسخ ہو جانا، یا جدید عربی کا مکمل فرنگی زبان بننا کیسے کہا جا سکتا ہے"؟

**جواب سنیے!** "اب تک سینکڑوں علمائے حق نے جدید عربی کے حقائق کو واضح کرنے کے لیے سینکڑوں کتابیں لکھی ہیں۔ یہ علماء 'قدیم عربی، جدید عربی، عامی زبان، نیز انگریزی اور فرانسیسی، سبھی زبانوں کو اچھی طرح جانتے ہیں اور ان کے نشیب و فراز سے خوب خوب واقف ہیں۔۔ یہ تمام علماء صراحت کے ساتھ یہ بات کہہ رہے ہیں کہ اگر انگریزی و فرانسیسی زبانوں کی صرف کچھ ترکیبیں اور لب و لہجے ہی جدید عربی میں داخل ہوئے ہوتے تو ہم کتابیں لکھنے کی زحمت ہرگز نہ کرتے؛ مگر اصل بات یہ ہے کہ جدید عربی مکمل فرنگی زبانوں کا لفظی ترجمہ ہے۔ فرنگی زبانوں کے قالب میں ڈھلی ہوئی ہے اور عربی حروف میں فرنگی زبان ہے۔ (کتاب مؤلف ص ۱۵۰)۔

چنانچہ شیخ احمد الغامدی لکھتے ہیں: «ليست هذه العجمة في الألفاظ والتراكيب والأساليب شيئا زيد بالعربية فكثرها، وإنما هو إماتة للعربية وفرنجةٌ.. ولو كان هذا التحريف يسيرا قليلا لما تكلفنا الكلام فيه والتنبيه عليهم ولكنه تبديل لكلام العرب كله وقلبه كلاما فرنجيا ليس له من العربية إلا ظاهره وأدبار الفاظه" (العرنجيه ص: ٤٦)
یعنی الفاظ وتراکیب اور ساختوں کی عجمیت عربی زبان کے لیے اضافہ اور توسیع نہیں ہے؛ بلکہ یہ عربی کو ختم کرنا اور اس کو فرنگی زبان بنانا ہے؛ اگر یہ تحریف معمولی ہوتی تو ہم اس پر کچھ کہنے یا تنبیہ کرنے کی زحمت ہرگز نہ کرتے؛ لیکن یہ عربی زبان کو بدل ڈالنا اور اس کو فرنگی میں تبدیل کرنا ہے۔ جس میں عربی زبان کا صرف ظاہر اور عربی الفاظ کی صرف دم باقی رہ گئی ہے۔ (کتاب مؤلف ص ۱۵۲)۔

## جزئیات

اصول کلیات کے بعد اب تیسری قسط کی کچھ جزئیات پر بحث کی جاتی ہے اور اب یہاں سے طرز وہی رہے گا جو پہلی قسط میں رہا ہے کہ پہلے مؤلف کی ذکر کردہ مثال کو پیش کیا جائے گا، پھر اس پر تبصرہ نگار کے "تبصرہ" کو، پھر راقم اس تبصرے پر اپنا "تبصرہ بر تبصرہ" پیش کرے گا، اور عنوان بھی حسب سابق اول کے لیے "مثال" ثانی کے لیے "تبصرہ" اور ثالث کے لیے "تبصرہ بر تبصرہ" رہے گا۔

# مثالیں اور تبصرے

# اور تبصرے پر تبصرے

**پہلی مثال**: يدرس النحو والصرف كموضوع مستقل: (القراءة الواضحه، جزءاول: ص: ٥)۔ یہ فرنگی ترکیب ہے۔ متعدّد علماء نے اس کی تردید کی ہے۔ سعید الافغانی نے اس" كاف" کا نام «الكاف الفرنسية» رکھا ہے اور ڈاکٹر تقی الدین الہلالی نے اس کا نام «الكاف الدخيلة الاستعمارية» رکھا ہے۔ (کتاب مؤلف ص:۴۵۵۔ بحوالہ: لغة الجرائد ص:١٠٤. وكتاب العرنجيه، ص:١٣٩. وتقويم اللسانين، ص:١٠. وأخطاء لغوية شائعة، ص:٢٦. واغلاط الكتاب لكمال ابراهيم ص:١٣. والأخطاء الشائعة في استعمالات حروف الجر ص:٢٦١. ومعجم التقويم اللغة، ص:١٩. ومظاهر التجديد النحوي لدى مجمع اللغةالعربية في القاهرة، ص:١٥٢. وأثر اللغات الإفرنجية في العربية العصرية، ص:٦. ومعجميات للدكتور إبراهيم السامرائي، ص٢٨. وتعابير أوروبية في العربية الحديثةمن معجميات إبراهيم السامرائي، ص٣٧٠. ونحووعي إسلامي للدكتور مازن المبارك، ص:٢٠٣).

**تبصرہ**: بلا شبہ علامہ ہلالی نے اس کو "کاف دخیلہ استعماریہ" کا نام دیا ہے اور بعض مصنفین نے ان کی تائید کی ہے؛ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس تعبیر کی کثرت استعمال اور سبک ہونے کی وجہ سے مصر کی مجمع اللغۃ العربیۃ نے اسے منظوری دی ہے... مجمع... کے اراکین نے متعدّد مجلسوں میں اس پر بحث کی۔ بعض کی رائے اسے مرفوض کرنے کی تھی اور بعض اسے کلام عرب کا حصہ سمجھتے تھے؛ لیکن خوب گرما گرم بحث کے بعد مجمع نے اسے قبول کیا۔ مجمع کی قبولیت نے اس کے استعمال کو مزید تقویت دی اور اس کے استعمال میں خوب اضافہ ہوا۔ (نوری جائزہ، تیسری قسط، ص:۹)۔

**تبصرہ بر تبصرہ:** خدا کا شکر ہے کہ آپ نے یہ تو تسلیم کر لیا کہ یہ کاف "بلاشبہ... کاف دخیلہ استعماریہ... ہے اور یہی وجہ ہے کہ "بعض کی رائے اسے مرفوض کرنے کی تھی... لیکن خوب گرما گرم بحث کے بعد مجمع نے اسے قبول "کر لیا۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ عربی زبان کے مزاج و مذاق سے آشنا غیور اہل زبان عرب علماء کے اس ترکیب کو فرنگی کہنے، اس بنا پر اسے مرفوض کرنے اور اس کے لیے گرما گرم بحث کرنے کے باوجود، کیا صرف اس وجہ سے اسے "فرنگی ترکیب کہہ کر مسترد کرنا درست نہیں" رہ جائے گا اور وہ عربی ترکیب ہو جائے گی کہ "مجمع نے اسے منظوری دے دی اور اسے قبول کر لیا"۔

خدارا! ہوش کے ناخن لیں! قاہرہ کی اس مجمع کے اراکین اور اس کی قراردادوں سے ناآشنا شخص کو تو کچھ مغالطہ ہو سکتا ہے؛ لیکن واقفین کے لیے اس مجمع کی منظوری و عدم منظوری کا ناقابل اعتبار ہونا روز روشن کی طرح بالکل واضح ہے؛ کیونکہ آراء المستشرقین حول القرآن الکریم کے مصنف الدکتور عمر بن ابراہیم رضوان کے حوالے سے مؤلف لکھتے ہیں کہ: "قاہرہ کی مجمع اللغۃ کی قراردادیں پڑھنے سے محسوس ہوتا ہے کہ "مجمع" کے ممبران صرف اس لیے بیٹھے ہیں کہ عربی زبان کو فرنچ اور انگریزی کے قالب میں کس طرح ڈھالا جائے۔ مجمع کا سارا زور اس پر ہوتا ہے کہ بوگس تاویلات کے ذریعے اخباری عربی کے اغلاط کی تصویب کی جائے اور نئے قوانین پاس کر کے پرانے قواعد کو توڑ دیا جائے"۔ (کتاب مؤلف ص:۳۹۵. بحوالہ: آراء المستشرقین حول القرآن الكريم للدكتور عمر بن ابراهيم رضوان، ص:٥٦، و ص:٦١).

سر دست یہ بھی سنتے چلیے کہ آخر کار ایسی قراردادیں اور تجویزات منظور کیوں کر ہو سکیں؟

"ڈاکٹر عمر بن ابراھیم رضوان اپنی کتاب «آراء المستشرقين حول القرآن الكريم» میں، اور ابو نصر محمد بن عبد اللہ الامام اپنی کتاب «المؤامرة الغربية» میں رقم طراز ہیں: «تمكن المستشرقون ان يتسللوا الى مجمع اللغوى في مصر . . . الخ» یعنی: مستشرقین مصر کی مجمع اللغۃ، دمشق کی مجمع اللغۃ، اور بغداد کی مجمع اللغۃ میں گھسنے میں کامیاب ہو گئے"۔... چنانچہ "سن ۱۹۲۱ء

میں دمشق کی مجمع میں ۶۶ مستشرق ممبران تھے۔ جو فرانس، اٹلی، برطانیہ، ہالینڈ، سوئیٹزرلینڈ اور اسپین وغیرہ سے تعلق رکھتے تھے اور مصر کی مجمع میں ۷ امستشرق ممبران تھے۔ جو فرانس، اٹلی، برطانیہ، لاووست اور ینبرگ وغیرہ کے باشندے تھے۔ جن میں فرانس کا "لوئس ماسینیون" نامی شخص اسلام کا خطرناک دشمن تھا۔ ابونصر محمد بن عبداللہ الامام نے ان سب کو نام بنام ذکر کیا ہے "(کتاب مؤلف ص۳۹۶)۔

اور پھر یہ تعداد بھی سو سال پہلے کی ہے جب مجامع میں مستشرقین کی صرف شمولیت ہوتی تھی ؛مگر بعد میں ان مجامع پر مستشرقین کا مکمل قبضہ ہو گیا۔ (أیضًا)۔

چنانچہ "ابونصر محمد بن عبداللہ الامام آگے لکھتے ہیں: «إن المستشرقين تسللوا إلى بعض المجامع اللغوية الاسلامية ؛ليتمكنوا من إفسادها و لينشروا من خلالها ما يحاربون به اللغة الفصحى، و من هذه المجامع مجمع اللغة في القاهرة» یعنی: مستشرقین بعض لغوی اسلامی مجامع میں گھس گئے تاکہ وہ ان کو برباد کر سکیں اور فصیح عربی زبان کے خلاف زہریلے مواد شائع کر سکیں ان مجامع میں سے قاہرہ کی مجمع اللغۃ بھی ہے (کتاب مؤلف: ص۳۹۶)

..." بے شمار مستشرقین اور ان کے چیلے عالم عرب کی مجامع اللغہ پر قابض تھے اور آج بھی ہیں۔ جن کو مختلف علماء نے تفصیل و تحدید کے ساتھ اپنی اپنی کتابوں میں ذکر کیا ہے۔ آج مجامع اللغہ کے تقریباً سبھی ممبران "الا ما رحم ربي" مستشرقین یا ان کے چیلے ہیں یہ سب بھیڑیے نما انسان پہرے دار بن کر مجامع اللغہ میں گھسے ہوئے ہیں اور عربی زبان کی کھال اتار کر اس کا مثلہ بنانے، اور عربی زبان کو فرنگی قالب میں ڈھالنے میں مصروف ہیں۔ جو بھی غلطی مشہور اور عام ہو جاتی ہے سب مل کر اس کو پاس کر دیتے ہیں۔ اگر ۹۹ دلیلیں یہ کہیں کہ یہ غلط ہے اور ایک " شاذ قول" سے اشارہ مل جائے کہ یہ جائز ہے تو یہ لوگ اسی شاذ کے اشارے پر غلطی کی تصویب کر دیتے ہیں، اور اگر کوئی غلطی عام ہو جائے اور اس کی تائید میں کوئی قول بھی نہ ملے تو اس وقت قواعد سے خروج کر کے غلطی کو پاس کر

دیتے ہیں اور اس خروج کا نام انہوں نے "انزیاح" رکھا ہوا ہے۔ (کتاب مؤلف ص:۳۹۷)۔

اور یہ بات بھی صرف ہوائی نہیں ہے کہ بلکہ مؤلف نے صفحہ نمبر ۴۰۰ پر عربی کتب کے حوالے سے ان مجامع میں سے سب سے اہم مجمع: قاہرہ کی مجمع اللغۃ کی لغوی تحریفات کی ۱۸ مثالیں ذکر کی ہیں۔ اور ان ۱۸ مثالوں کے علاوہ عیسائیت کی دعوت اور داعی کے لیے «تنصیر و منصر» کے بجائے «تبشیر و مبشر» کو رائج کرنا؛ تاکہ عیسائیت کی بات خوش خبری سمجھی جائے۔ دہشت گردی اور دہشت گرد کے لیے «إفساد و مفسدون» کے بجائے «إرهاب و إرهابی» کو رائج کرنا؛ تاکہ قرآن کریم پر دہشت گردی کی تعلیم دینے کا الزام لگایا جاسکے ﴿ترهبون به عدو الله وعدوكم﴾ نیز دینی علماء کو «رجال الدين» کہنا اور لفظ «علم و علماء» کو سائنس اور سائنس داں کے لیے خاص کرنا؛ تاکہ یہ سمجھا جائے کہ علم اور علماء تو یہی ہیں، دین علم اور علماء، علم و علماء کہلانے کے مستحق نہیں وغیرہ وغیرہ۔ قاہرہ کی مجمع نے ان تمام سازشی تعبیرات اور فرنگی تراکیب کی اجازت دے دی ہے... اس موضوع پر بہت سی کتابیں لکھی جاچکی ہیں خالد بن سعود بن فارس العصیمی کی کتاب «القرارات النحوية والتصريفية لمجمع اللغة بالقاهرة» ۸۱۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر یاسین ابوالہیجاء (جامعۃ الاسراء، کلیۃ الآداب) کی کتاب «مظاهر التجديد النحوى لدى مجمع اللغة العربيه فى القاهرة» ۳۴۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ ان کے علاوہ مکتبہ شاملہ میں "جملة قرارات مجمع اللغة العربيه بالقاهرة" اور «قرارات مجمع اللغة العربية بالقاهرة» نامی مزید دو اور کتابیں بھی موجود ہیں۔ (کتاب مؤلف ص:۴۰۳)۔

اب جس اکیڈمی کے اراکین اور قراردادوں کی یہ حالت ہو تو کیا اس کی منظوری و عدم منظوری قابل اعتبار؛ بلکہ لائق التفات بھی ہوسکتی ہے ؟؟؟۔ حاشا و کلا۔

**دوسری مثال**: يكلف المعلم التلميذ... بقراءة درس: (القراءة الواضحة، الجزء الاول ص:۷). "کلف" کے صلہ میں "باء" لانا غلط ہے۔ خود مولانا نور عالم صاحب خلیل امینی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی "متى تكون الكتابات مؤثرة" میں اس کو غلط کہا ہے۔ (کتاب مؤلف

ص۴۵۵۔ بحوالہ: متى تكون الكتابات مؤثرة، ص: ٦٣. واغلاط الكتاب لكمال، ص: ٧. والاخطاء الشائعه في استعمالات حروف الجر، ص: ۱۸۰. والمعجم الوجيز في الاخطاء الشائعه، ص: ۹۱. ومعجم المنتقى من الخطا والصواب، ص: ۳۳۳. ونحو وعي اسلامي، ص: ۱۹۹. واخطاءنا في الصحف والدواوين، ص: ۲۵۵).

**تبصرہ**: "كلف" کا صلہ "باء" کے ساتھ محدث ہے۔ "كلف" کو باء صلہ کے ساتھ استعمال کیا جاتا رہا ہے، اگرچہ فصحاء کے نزدیک یہ عامی تھا؛ مگر اسے فصیح مان لیا گیا ہے۔ وكلفه بالامر: وكله اليه (محدثة). (العامي الفصيح ۲۲/۱۱). (نوری جائزہ، (۳/۹).

**تبصرہ بر تبصرہ**: اگر اسے فصیح مان لیا گیا تھا تو حضرت الاستاذ مولانا نور عالم صاحب خلیل امینی رحمۃ اللہ علیہ نے "متى تكون الكتابات مؤثرة" میں اسے غلط کیوں کہا؟

ایک طرف تو "حضرت الاستاذ (مولانا) نور عالم (صاحب) خلیل امینی رحمۃ اللہ علیہ کی عربی دانی، زبان و بیان میں ان کی دقت نظری، اور ان کے دلکش عربی اسلوب کے لفظی، معنوی اور ترکیبی خصوصیات، ... اور مجلۃ الداعی کے مختلف کالموں میں ان کے اسلوب نگارش" پر مستقل کتاب لکھنے کو "نئے تعلیمی سال کے علمی منصوبوں میں شامل "کیا جارہا ہے۔

اور دوسری طرف مؤلف نے ان کا حوالہ کیا دے دیا تو وہ ایسے ناقابل التفات ٹھہرے کہ دبے لفظوں میں ان کی بھی تغلیط کی جارہی ہے۔

اب آپ بتائیں کہ کیا آپ کی یہ توجیہ بالواسطہ حضرت مولانا امینی صاحب کی تجہیل و تغلیط پر مشتمل نہیں؟

ع الجھا ہے پاؤں یار کا، زلف دراز میں

اور ہاں! ذرا یہ تو بتائیے کہ کن لوگوں نے اسے فصیح مانا ہے؟ کیا قاہرہ کی مجمع اللغۃ العربیہ نے؟ جو مستشرقین کا سب سے بڑا اڈہ ہے۔ جس کے اراکین اور قراردادوں کا حال ابھی آپ نے ملاحظہ کیا۔ اب جس اکیڈمی کی حالت زار یہ ہو کیا اس کی منظوری و عدم منظوری کو استدلال میں پیش کیا جاسکتا

ہے۔بتعبیرِ جدید عربی: «لا و لن»۔

پھر لطف یہ ہے کہ آپ نے جو عربی عبارت پیش کی اس میں بھی محدث ہونے کی بات تو ہے لیکن اسے فصیح مان لیا گیا ہے اس پر دال کوئی لفظ و عبارت نہیں۔

مستزاد یہ کہ حوالہ بھی آپ ایسی کتاب کا دے رہے ہیں یعنی « **العامی الفصیح** » کا جس کے عنوان سے ہی اس کا معنون ظاہر ہے کہ اس کتاب میں عامی الفاظ کو فصیح ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اور عامی کو فصیح ثابت کرنا اور اس کے رواج کی ترغیب دینا یہ بھی تحریک جدیدیت اور مستشرقین کے سازشی حربوں کا ایک اہم حصہ ہے جس کو بے نقاب کرنے کے لیے باضابطہ پوری ایک کتاب ہی لکھ دی گئی۔ ملاحظہ ہو: **تاریخ الدعوۃ إلی العامیہ و آثارھا في مصر** »۔ اور ڈاکٹر فہد خلیل زائد نے اپنی کتاب « **العربیة بین التغریب و التھدید** » میں لکھا ہے: جس کا ترجمہ یہ ہے کہ "شروع میں قاہرہ کی مجمع اللغۃ العربیہ میں کچھ اچھے لوگ تھے ؛مگر بعد میں جب اخباری عربی والوں نے اس کی باگ ڈور سنبھالی تو انہوں نے مجمع کو عامی زبان کی اہمیت بتائی اور فصیح عربی زبان پر جمود اور زمانے کے ساتھ چلنے سے اس کے عاجز ہونے کا الزام لگایا۔ (کتاب مؤلف ص:۳۹۶)۔

الحاصل جو کتاب فرنگی سازش سے متاثر ہو کر تحریک جدیدیت کی حامی و داعی ہو وہ قدیم عربی والوں کے بر خلاف مستدل بننے کی صلاحیت بالکل بھی نہیں رکھتی۔

**تیسری مثال**: **فإذا تأکد من فھم التلمیذ**: یہ فرنگی ترکیب ہے۔ **تأکد الشيء**: کسی چیز کا پختہ ہونا۔ جو چیز پختہ ہوگی وہ فاعل بنے گی۔ اہل عرنگی نے "sure" اور "confirm" کے لفظی ترجمے میں انسان کو فاعل بنا کر شے پر "من" داخل کر دیا جو کہ تحریف ہے۔ (کتاب مؤلف، ص:۴۵۵)۔

**تبصرہ**: پوری کتاب میں یہی انداز گفتگو ہے کہ فلاں لفظ کے ترجمے میں یہ لفظ چلا دیا۔ انگریزی کے کسی لفظ کا عربی کے کسی لفظ سے ترجمہ کیا گیا تو اس میں کون سی غلطی ہے؟ (نوری جائزہ:۱۰/۳)۔

**تبصرہ بر تبصرہ:** پہلے مؤلف کی تفصیلی عبارت ملاحظہ ہو: "تأكّد" یہ "أكّد" کا مطاوع ہے۔ تأكّد الشيء: اشتدّ، وتوثّق کسی چیز کا مضبوط و پختہ ہونا، اور جو چیز پختہ ہو اسی کو فاعل بنایا جائے گا؛ مگر اہل عرنگی نے "sure" یا "confirm" کے ترجمے میں انسان کو فاعل بناکر شئے پر "من" داخل کرکے رائج کر دیا، جو تحریف ہے۔ فرنگی عربی والے "I made sure he came" کا ترجمہ کرتے ہیں: «تأكّدت من قدومه» جو کہ غلط ہے۔ صحیح یہ ہے۔ تأكد لي قدومه /تحققت قدومه/تيقنته/ استيقنته/ توثقت في قدومه /استوثقت من قدومه. (کتاب مؤلف، ص:۳۶۷. بحوالہ: تقويم اللسانين، ص:۱۳۱. ونحو إتقان الكتابة باللغة العربية، ص:۲۵. وقل ولا تقل، ص:۱/۳۵. عثرات الأقلام لبشار، ص:۱۳. وشموس العرفان بلغة القرآن، ص:۲۵. أزاهير الفصحى في دقائق اللغة، ص:۸۰. الأخطاء الشائعة في استعمالات حروف الجر للدكتور محمود إسماعيل عمار، ص: ۲۴۲، و۲۴۹. ومعجم تقديم اللغة للدكتورة هلا أمون ۷).

اب سنیں! غلطی مطلق ترجمہ نہیں؛ بلکہ فرنگی سازش کے زیر اثر لفظی ترجمہ ہے۔ اب آپ ہی ارشاد فرمائیں کہ جب "I made sure he came" کی تعبیر اور ترجمے کے لیے "تأكد لي قدومه /تحققت قدومه/تيقنته/ استيقنته/ توثقت في قدومه/استوثقت من قدومه" جیسی فصیح عربی تعبیرات اور ترجمے موجود تھے تو پھر "تاكد" کے صلہ میں خواہ مخواہ "من" بڑھاکر اس تحریف کی ضرورت ہی کیا آپڑی تھی؟ اگر اس کو بھی بلاضرورت عربی زبان میں ترمیم بمعنی تحریف نہ کہا جائے تو پھر اور کیا نام دیا جائے؟

**تبصرہ:** اس تعبیر کا استعمال پہلی بار انگریزی لفظ کے ترجمے میں ہی ہوا ہو اس کی کوئی دلیل نہیں۔ (نوری جائزہ:۱۰/۳)۔

**تبصرہ بر تبصرہ:** تو پھر آپ ہی دلیل پیش فرمادیں کہ اس تعبیر کا استعمال پہلی بار کب؟ کیسے؟ اور کیوں ہوا؟ اور کس نے کیا؟

باقی مؤلف نے جو کچھ کہا ہے اس پر انہوں نے عربی کتب سے دسیوں حوالے بھی پیش کر ڈالے ہیں۔

**تبصرہ**: "تأکد" کے ساتھ "من" کے استعمال کو ادبا اور نقاد نے ناپسند کیا ہے۔ مؤلف میں جن کتابوں کا حوالہ دیا ہے ان میں سے کسی میں بھی اسے نہ تو فرنگی ترکیب کہا گیا اور نہ ہی کسی انگریزی لفظ کا ترجمہ ہونے کی بات کہی گئی، تو سوال یہ ہے کہ نقد کا یہ غیر علمی اور غیر سنجیدہ طریقہ پر حوالہ پیش کرنے کی ضرورت کیا تھی؟ (نوری جائزہ (۳/۱۰)۔

**تبصرہ بر تبصرہ**: سوال تو آپ سے ہے کہ "نقد کا یہ غیر علمی اور غیر سنجیدہ طریقہ" اختیار کرنے کی آپ کو "ضرورت کیا تھی؟" کہ آپ الزام تو رکھ رہے ہیں اتنا بڑا کہ "مؤلف نے جن کتابوں کا حوالہ دیا ہے ان میں سے کسی میں بھی اسے نہ تو فرنگی ترکیب کہا گیا اور نہ کسی انگریزی لفظ کا ترجمہ ہونے کی بات کہی گئی" اور اپنے اس الزام کی دلیل میں ان کتابوں کی ایک بھی عبارت پیش نہیں کر رہے ہے۔

اگر ان کتابوں میں وہ نہیں کہا گیا جو مؤلف کہہ رہے ہیں تو پھر کہا کیا گیا ہے؟ یہ تو بتائیں۔ کیا ان کتب میں «تأكد من كذا» کا تذکرہ ہی نہیں؟ یا تذکرہ تو ہے؛ لیکن اس کے متعلق وہ بات نہیں جو مؤلف کہہ رہے ہیں؟

آپ اولاً اپنے دعوی کو منقح کریں، پھر جو بھی دعوی ہو اس پر دلیل پیش کرنے کی بھی زحمت گوارا کریں۔

جبکہ مؤلف نے اگر دعوی فرنگی ترکیب کا کیا ہے تو وہ دلیل میں انہی عربی کتب سے وہ فرنگی ترکیب بھی ساتھ ساتھ ذکر کر رہے ہیں جس کا وہ لفظی ترجمہ ہے۔ ملاحظہ ہو اس مقام کی عبارت جہاں مؤلف نے اس پر مفصل گفتگو کی ہے کہ: "فرنگی عربی والے "I made sure he came" کا ترجمہ کرتے ہیں: «تأكدت من قدومه» جو کہ غلط ہے۔ صحیح یہ ہے: **تأكد لي قدومه/تحققت قدومه/تيقنته/استيقنته/توثقت في قدومه/استوثقت من قدومه**. (کتاب مؤلف، ص:

۳۶۷. بحوالہ: عربی حوالہ جات ابھی گزرے)

آپ کے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ ایک ہی بحث کا مقام تفصیل آپ کے ذہن سے محو ہو جاتا ہے اور اس کا مقام اختصار دیکھ کر آپ اعتراض کرنے کی غلطی کر بیٹھتے ہیں۔

پھر یہ بھی تو فرما دیں حضور کہ جب آپ ہی کے بقول "تاکد کے ساتھ "من" کے استعمال کو ادباء اور نقاد نے ناپسند کیا ہے "تو اس ناپسندیدگی کے وجہ آخر کیا ہے؟ ہمیں تو صاف سمجھ میں آتا ہے کہ وجہ اس کا "عربی ترکیب سے ہٹ کر فرنگی ترکیب ہونا" ہے اگر آپ کے نزدیک وجہ کچھ اور ہے تو اس کو مع حوالہ جات پیش فرمائیں۔

**تبصرہ**: لیکن یہ بھی پیش نظر رہے کہ یہ عوام کا استعمال نہیں؛ بلکہ ادباء اور فصحاء کے کلام میں بھی یہ ترکیب کسی فصیح لفظ کی طرح ہی مستعمل ہے یقین نہ آئے تو قابل اعتماد ادباء کی فہرست بنالی جائے اور ان کے کلام کا بغور مطالعہ کیا جائے۔ (نوری جائزہ: ۳/۱۰)۔

**تبصرہ بر تبصرہ**: آپ ہی فہرست مہیا کر دیتے تو واضح ہو جاتا کہ آپ کے نزدیک "قابل اعتماد" ہونے کا معیار کیا ہے؟ آیا جدید فرنگی عربی کا متوالا ہونا؟ یا قدیم عربی سے چمٹے رہنا؟

**چوتھی مثال**: في جنينة حامد: شجر - ورد - زهر - بركة - سمكة. اس جملے میں دو غلطیاں ہیں: اول: یہ کہ مفردات کے درمیان واو عاطفہ نہ لانا فرنگی ترکیب ہے۔ (کتاب مؤلف، ص:۴۵۵۔ بحوالہ: عثرات الأقلام لبشار، ص۳۲. وأخطاؤنا في الصحف والدواوين للزعبلاوي، ص:۱۰٤)۔ دوم یہ کہ پہلے تین اسماء کو بغیر تاء کے اسم جنس جمعی لایا گیا ہے اور آخری اسم "سمکۃ" کو تاء کے ساتھ مفرد لایا گیا ہے۔ جو غلط ہے؛ بلکہ یہ بھی "سمک" اسم جنس جمعی استعمال ہوگا۔ یہ اسی کا مقام ہے۔ (کتاب مؤلف، ص:۴۵۵. بحوالہ: شرح التصريح على التوضيح، ۱/۱۸. وحاشية الصبان على شرح الأشموني، ص:۱/۳۸. والنحو الوافي، ص:٤/٦٨١. وجامع الدروس العربية، ص:۲/٦٥. والأخطاء اللغوية الشائعة لأمين طه عبد الغفور الفلسطيني، ص:٤٤. وجامع العدد والتاريخ، ص:٥٧. وتهذيب النحو،

ص:٢٦).

**تبصرہ**: پہلی بات کہ مفردات کے درمیان واؤ عاطفہ لانا فرنگی ترکیب ہے۔ اس بات پر مؤلف نے دو حوالے پیش کیے۔ دونوں جگہ یہ بات مذکور نہیں ہے۔ آگے پیچھے بھی دیکھے۔ یہ بات مذکور نہیں تھی، تو یہ حوالہ کس بات پر ہے۔ (نوری جائزہ:۱۱/۳)۔

**تبصرہ برتبصرہ:**

آنکھیں اگر ہوں بند تو پھر دن بھی رات ہے

اس میں بھلا قصور کیا ہے آفتاب کا

مؤلف نے دو حوالے پیش کیے ایک (عثرات الأقلام لبشار ص:٣٢) اس کتاب کی اسی صفحہ کی عبارت پیش خدمت ہے: **يقولون: المحافظات السورية: هي دمشق، حمص، حماة، حلب، الرقة، اللاذقية ... الخ دون الإتيان بالواو بين المعطوفات. وينبغي أن يقال دمشق، وحمص، وحماة، وحلب، وهكذا. فإسقاط الواو هنا جاء من اللغات الأجنبية ففي الإنجليزية مثلاً لا توضع الواو إلا مع آخر المعدودات أو المعطوفات.** (ص:٣٢)

اور دوسرا حوالہ ہے(**أخطاؤنا في الصحف والدواوين**، ص: ١٠٤) اس حوالے میں صفحے کے تعلق سے ذرا چوک ہوگئی ہے یہ عبارت ص:۱۲۲ پر مذکور ہے اور حوالہ مولف نے صفحہ ۱۰۴ کا دے دیا ہے؛ لیکن مراجعت کا اصل طریقہ یہ نہیں ہے کہ جس صفحہ کا حوالہ دیا گیا ہے اسی صفحہ میں عبارت تلاش کی جائے؛ کیونکہ عین ممکن ہے کہ نسخوں کا اختلاف ہو اور صفحات کے نمبرات الگ الگ ہوں؛ لہذا صحیح طریقہ مراجعت کا یہ ہے کہ فہرست عناوین سے مسئلہ کا مظان تلاش کیا جائے اور اس میں دیکھا جائے۔ جب تبصرہ نگار آگے پیچھے دیکھنے کی زحمت اٹھا رہے ہیں تو فہرست عناوین دیکھنے ہی کی زحمت اٹھا لیتے اگر وہ یہ زحمت گوارا کر لیتے تو فہرست ہی میں «**حذف حروف**

العطف» کا مرکزی اور جلی عنوان، نہ کی ذیلی اور خفی عنوان ان کی نظروں سے کبھی اوجھل نہ رہتا اور انہیں نوبت اعتراض نہ آتی۔ ص:۱۲۲ کی عبارت نظر نواز ہو:

«حذف حروف العطف»

قد اشتهر عن كتاب الدواوين أنهم يحذفون أ حرف العطف، اذا ما تكرر المعطوف، فيقولون قد وافقنا على طرد التلاميذ: احمد، خالد، سعيد، وقد دخلنا الصفوف: الاول، الثاني، الثالث، ويكتفون بذكر العاطف حينا قبل المعطوف الأخير، ويقولون سرح السادة المعلمون: محمد...، سليم...، صبحي...، ورشدي. وفاق النهج الفرنسي المتمكن من طباعهم.

والصواب في كل ذلك إثبات العاطف فتقول :قد وافقنا على طرد التلاميذ: أحمد، وخالد، وسعيد. وتقول: وقد دخلنا الصفوف: الأول، والثاني، والثالث. كما تقول سرح السادة المعلمون: محمد.. وسليم.. وصبحي.. ورشدي، ...فانظر إلى قوله تعالیٰ: حرمت عليكم امهاتكم وبناتكم واخواتكم وعماتكم وخالاتكم وبنات الاخ وبنات الاخت وامهاتكم اللاتي ارضعنكم واخواتكم من الرضاعة وأمهات نسائكم وربائبكم اللاتي في حجوركم من نسائكم اللاتي دخلتم بهن. الآية. كيف اثبتت فيه حروف العطف!! (وأخطاؤنا في الصحف والدواوين ص:۱۲۲)۔

**تبصرہ**: اگر یہ ترکیب فرنگی ہوتی تو آخر سے پہلے واؤ آنا چاہیے کہ انگریزی زبان میں اخر سے پہلے and لگاتے ہیں۔ (نوری جائزہ، ص:۳/۱۱)۔

**تبصرہ بر تبصرہ**: آپ کے اعتراض کا ماحصل یہ ہے کہ "پوری پیروی کیوں نہیں کی؟ ادھوری کیوں کی؟" تو یہ کوئی ایسا اعتراض تو نہیں؛ اس لیے کہ اتباع و پیروی میں کبھی تو «تلک بتلک» اور «حذو النعل بالنعل» والا معاملہ ہوتا ہے اور کبھی "آدھا تیتر اور آدھا بٹیر" کا اصول بھی کارفرما ہوتا ہے۔ اور یہ دوسری چیز زبان کے لیے اور زیادہ قبیح ہے کہ نہ تو زبانِ مترجم منہ کی مکمل

پیروی ہو اور نہ زبان مترجم الیہ کی،

نہ خدا ہی ملا، نہ وصال صنم

نہ ادھر کے رہے، نہ ادھر کے ہم

اور ہاں! مؤلف کی ذکر کردہ مثال میں گرچہ پوری پیروی نہیں ہے؛ لیکن جدید عربی میں مکمل پیروی کی بھی مثال ملتی ہے جیسا کہ **وأخطاؤنا في الصحف والدواوين** کے مؤلف فرماتے ہیں: **ويكتفون بذكر العاطف حيناً قبل المعطوف الأخير ويقولون: سرح السادة المعلمون: محمد.. سليم.. صبحي.. ورشدي.**

**تبصرہ**: پہلے اسم جنس جمعی کو بغیر تاء کے لایا گیا ہے تو "**سمكة**" میں بھی نہیں لانا چاہیے۔ یہ بات تو خالص اسی عبارت کے سیاق میں ہے۔ اس پر حوالہ پیش کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ پھر انسان حوالے میں کیا تلاش کرے؟ مؤلف نے اس پر سات حوالے پیش کیے ہیں۔ کوئی صاحب شعور بتادے کہ یہاں پر حوالے میں انسان کیا تلاش کرے؟ یہ کون سی تحقیق ہے؟(نوری جائزہ، ص۱۱/۳)۔

**تبصرہ بر تبصرہ**: اگر کوئی صاحب شعور آپ کو میسر آجائے بشرطیکہ وہ صاحب شعور ہو بھی، اور عقل و شعور سے کام بھی لے، تو وہ آپ کو یہ بتادے گا کہ "کبھی مختلف کتب کے حوالے اس لیے بھی دیے جاتے ہیں کہ وہ ایک بات مکمل طور پر ان میں سے کسی میں موجود نہیں ہوتی؛ لیکن متفرق طور پر ان سب میں تھوڑی تھوڑی اس طرح موجود ہوتی ہے کہ اگر ان سب کو یکجا کیا جائے تو وہ بات نکھر کر سامنے آجاتی ہے"۔ مذکورہ مقام پر مؤلف نے چونکہ مذکورہ اصول اپنایا ہے؛ اس لیے اعتراض درست نہیں۔

**پانچویں مثال**: **هل عندك خبز جيد... نعم عندي خبز جيد: القراءة الواضحة** کے تینوں اَجزاء میں جابجا لفظ جید آیا ہے جو فرنگی تعبیر ہے عربی زبان کے مزاج کے مطابق عمدہ کے

مفہوم کے لیے ہر موصوف کی صفت الگ آتی ہے، جس کی تفصیل پیچھے آچکی ہے؛ لیکن اہل عرنگی نے very good, "good" کہ ترجمے میں ہر جگہ "جید" ہی کو رائج کر دیا۔ جو سراسر فرنگی تعبیر ہے۔ مثلاً: خبز جید، ورق جید، لحم جید، کتاب جید، فواکه جيدة، بشكل جيد، المعروف جيداً، تعرف جيداً، جيد جداً، وغیرہ۔ (کتاب مؤلف، ص: بحوالہ: لسان غصن لبنان، ص: ۷. والعرنجية، ص: ۱٦۹. وأثر اللغات الإفرنجية لعربية العصرية، ص: ٤).

**تبصرہ**: ...رہ گیا یہ دعوی کہ عربي میں "عمدہ" کے مفہوم کے لیے ہر موصوف کی الگ صفت آتی ہے تو پہلے یہ بتانا چاہیے کہ "جید" کس چیز کے لیے خاص ہے؟

اب قدیم کتابوں سے نہیں، احادیث کی کتابوں سے "جید" کا استعمال بتایا جارہا ہے، غور کیا جائے:

(۱) فبقي مرط جيد (البخاري).

(۲) وهو قدح جيد عريض (البخاري).

(۳) رجل مؤمن جيد الإيمان (مسند احمد).

(٤) موضع جيد (شعب الإيمان).

(٥) هذا من جيد الحديث (شعب الإيمان).

(٦) إني جئتك بشراب جيد (مسند الصحابة).

(۷) بالغالية الجيدة عند إحرامه (شرح معانی الآثار).

(۸) ما يعطى من جيد الحنته ومن رديئها (شرح معانی الآثار).

(۹) بذهب غير مضروب جيد (شرح معانی الآثار).

یہ نو مثالیں سامنے ہیں۔ الگ الگ چیزوں کے لیے "جید" کو صفت بنا کر لایا گیا ہے۔ تو حضرت کیرانوی علیہ الرحمہ کا استعمال کیسے غلط ہوا؟ (نوری جائزہ ۱۳/۳)۔

**تبصرہ بر تبصرہ**: امام ثعلب، ابو علی فارسی، علامہ احمد ابن فارس اور ابو ہلال عسکری کے

نزدیک عربی زبان میں ترادف نہیں ہے (مجم أسماء الأشباه/اللبابيدي أحمد بن مصطفى الدمشقي، ص: ١٧) ہر لفظ کا محل استعمال الگ ہے۔ ہر ایک لفظ اپنے محل میں استعمال ہوتا ہے۔ کوئی ایک لفظ دوسرے کی جگہ استعمال نہیں ہوتا۔ ہاں کبھی کسی بلاغتی حکمت کی بنا پر یا استعارہ، کنایہ یا تشبیہ کے طور پر ایک لفظ دوسرے لفظ سے کی جگہ مجازاً استعمال ہو جائے تو الگ بات ہے۔ (کتاب مؤلف، ص: ۵۹)۔ ٹھیک اسی طرح صفت "عمدہ" کے مفہوم کے لیے مختلف الفاظ ہیں؛ مگر ہر لفظ کا محل استعمال اور موصوف الگ ہے۔ مثلاً: فرس جواد، درهم جيد، ثوب فاخر، متاع نفيس، غلام فاره، لحم طري، كتاب نافع، سيف جراز، درع حصداء، أرض عذاة، ناقة عيطل وغیرہ (فقه اللغة وسر العربية، الفصل السابع، للثعالبی) ان میں سے کوئی ایک لفظ و صفت بھی دوسرے کی جگہ اور دوسرے موصوف کے ساتھ استعمال نہیں ہوتا، ہاں کبھی کسی بلاغتی حکمت کی بنا پر استعارہ، کنایہ یا تشبیہ کے طور پر ایک لفظ دوسرے لفظ کی جگہ مجازاً استعمال ہو جائے تو الگ بات ہے۔

رہا یہ سوال کہ "جید کس چیز کے لیے خاص ہے؟" تو عرض ہے کہ

امام ابو منصور ثعالبي نے "فقه اللغة وسر العربية" میں ساتویں فصل اس بات کو بیان کرنے کے لیے قائم کی ہے کہ مختلف اشیاء کی "صفت عمدگی" کو بیان کرنے کے لیے "حقیقی معنوں" میں کون سا لفظ استعمال کیا جائے گا۔ اس مقام پر انہوں نے "جید" کو صفت بنایا "درهم" کی۔ اور بقیہ اور چیزوں کے لیے الفاظ دوسرے بیان کیے ہیں۔ ان کی عبارت ملاحظہ ہو: فرس جواد، درهم جيد، ثوب فاخر، متاع نفيس، غلام فاره، لحم طرى، كتاب نافع، سيف جراز، درع حصداء، أرض عذاة، ناقة عيطل. (فقه اللغة وسر العربية: الفصل السبع)

اسی طرح لسان العرب اور تاج العروس دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ "جید" کا استعمال کسی چیز کی اصالت، خلوص اور اس کے کھرا ہونے کو بتانے کے لیے ہے۔ ہاں مجازی طور پر وہ کسی اور موصوف کے لیے بھی استعمال ہو جائے تو اس کا انکار نہیں لیکن ایسا کم مقامات پر ہوتا ہے۔ اب

محترم تبصرہ نگار نے کیا یہ ہے کہ لفظ "**جید**" کو سرچ کیا اب مختلف کتب میں جہاں جہاں وہ مجازاً استعمال ہوا ہے وہ سب یکجا کر کے آپ کے سامنے پیش کر دیا جس سے ایسا محسوس ہونے لگا کہ بہت سے مقامات پر "**جید**" مختلف موصوف کے لیے آتا ہے؛ حالانکہ وہ موقع مجازاً استعمال ہونے کا تھا، اور یہی وجہ ہے کہ بخاری جیسی ضخیم اور دو بڑی بڑی جلدوں پر مشتمل کتاب میں "**جید**" صرف تین جگہوں پر آیا ہے جس میں سے دو کو تبصرہ نگار نے پیش کیا ہے اور ایک کو چھوڑ دیا ہے اور پوری **مسلم شریف** میں "**جید**" ایک بار بھی نہیں آیا ہے **شرح معانی الآثار**، **شعب الایمان** اور **مسند احمد** کا معاملہ بھی انہی پر قیاس کر لیجئے۔

**الغرض** احادیث میں اور قدماء عرب کے کلام میں اکا دکا مواقع پر "**جید**" کا دوسرے موصوف کے لیے آجانا از قبیلِ مجاز ہے؛ لیکن جدید عربی میں اس مجازی استعمال کو حقیقت کا درجہ دے کر ہر جگہ اسی کو رائج کر دیا گیا محض فرنگ کی تقلید میں، اور "good,very good" کی تعبیر کے قدم بقدم چلتے ہوئے، تو اصل نقد اس پر ہے اور بالکل بجا اور موزوں ہے۔

**چھٹی مثال**: **في أية ساعة تطلع**، مذکر و مونث دونوں کے لیے "أی" استفہامیہ بغیر تاء کے استعمال کرنا ہی فصیح ہے جیسے : **بأي ارض تموت**، (**في أي صورة ما شاء ركبك**، **فأي آيات الله تنكرون**) استفہام میں "أية" لکھنا قبیح ہے۔ (کتاب مؤلف، ص:۴۷۵۔ بحوالہ: **تقويم اللسانين، لتقي الدين الهلالي، ص: ۲۹، والمعجم الوجيز في الأخطاء الشائعة، للدكتور جودة مبروك محمد، ص:۱۷. ومعجم المنتقى من الخطأ والصواب، ص:۲۹. وأخطاؤنا في الصحف والدواوين، ص:۱۰۷. ومعجم الأخطاء النحوية واللغوية والصرفية لخضر ابي العينين، ص:۳۰۱**)۔

**تبصرہ**: "أية" کا استعمال حدیث میں ہے... صحیح البخاری کی یہ حدیث دیکھیں: (**حدثنا محمد بن يوسف حدثنا سفيان الثوري عن قيس بن مسلم عن طارق بن شهاب**) **أن أناسا من اليهود قالوا: لو نزلت هذه الآية فينا لاتخذنا ذلك اليوم عيدا فقال عمر:** "

أية آية" فقالوا: اليوم اكملت لكم دينكم واتممت عليكم نعمتي ورضيت لكم الاسلام دينا فقال عمر إني لأعلم أي مكان أنزلت، أنزلت ورسول الله صلى الله عليه وسلم واقف بعرفة. (صحيح البخاري: رقم: ٤٤٠٧).

**تبصرہ بر تبصرہ** : یہ حدیث بخاری کے شروع میں بھی آئی ہے۔ اس میں لفظ "أي" ہے۔ اسی طرح مسلم میں بھی جس جگہ آئی ہے، وہاں پر بھی "أي" ہے۔ روایات مع سند کے ملاحظہ ہوں: (١) حدثنا الحسن بن الصباح، سمع جعفر بن عون، حدثنا أبو العميس أخبرنا قيس بن مسلم، عن طارق بن شهاب عن عمر بن الخطاب أن رجلا من اليهود قال له: يا أمير المؤمنين! آية في كتابكم تقرؤونها لو علينا معشر اليهود نزلت لاتخذنا ذلك اليوم عيدا، قال: "أي آية" قال اليوم أكملت لكم دينكم وأتممت عليكم نعمتي ورضيت لكم الاسلام دينا. (صحيح البخاري رقم: ٤٥)

(٢) وحدثني عبد بن حميد، أخبرنا جعفر بن عون، أخبرنا أبو عميس، عن قيس بن مسلم، عن طارق بن شهاب قال: جاء رجل من اليهود الى عمر فقال: يا أمير المؤمنين! آية في كتابكم تقرؤونها لو علينا نزلت معشر اليهود لاتخذنا ذلك اليوم عيدا قال: "وأي آية" قال اليوم أكملت لكم دينكم وأتممت عليكم نعمتي لكم الإسلام دينا. (صحيح مسلم رقم: ٣٠١٧)

(٣) حدثنا أبو بكر بن أبي شيبة، حدثنا عبد الاعلى بن عبد الاعلى، عن الجريري، عن عبد الله بن رباح الأنصاري قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: أتدري أي آية من كتاب الله معك أعظم؟ قال: قلت: الله ورسوله اعلم، قال: يا أبا المنذر! أتدري أي آية من كتاب الله معك أعظم؟ قال: قلت: الله لا اله الا هو الحي القيوم قال: فضرب في صدرى وقال: والله ليهنك العلم أبا المنذر. (صحيح مسلم، رقم: ٨١٠)

توجب اسی روایت کے دو طریق میں "أي" آیا ہے اور ایک طریق میں "أية"، تو ایسا بھی تو ہو

سکتا ہے کہ اصل الفاظ حدیث تو "أي آية" ہوں اور "أية آية" والی روایت میں کسی عجمی راوی نے روایت المعنٰی سے کام لیا ہو اور "أي" کے بجائے "أية" کہہ دیا ہو اور چونکہ محدثین کے ہاں روایت بالمعنٰی جائز بھی ہے اور اس کا بلانکیر خوب شیوع بھی ہے؛ لہذا اس احتمال سے صرف نظر بالکل نہیں کیا جا سکتا اور جب اس روایت میں یہ احتمال موجود ہے تو اس میں مذکور الفاظ سے استدلال کرنا درست نہ ہو گا کیونکہ ضابطہ ہے: "وإذا جاء الاحتمال بطل الإستدلال"۔

بالفرض والتسلیم اگر یہ روایت بالمعنٰی نہ ہو روایت بالفظ ہی ہو تو بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہاں "أية" کا استعمال بطور شاذ ہے یعنی اس کا استعمال ۲ فیصد ہے اور جدید عربي میں سازش کے تحت یہی کیا گیا ہے کہ "فصیح الفاظ و تراکیب کو ختم کر کے شاذ اور غلط الفاظ و تراکیب کو خوب رائج کر دیا گیا" بایں طور کہ "عربي میں ایک لفظ پہلے فصیح اور رائج تھا مثلاً ۹۸ فیصد استعمال ہوتا تھا اس کے بالمقابل ایک دوسرا لفظ ہے جو پہلے عربي میں غیر فصیح اور شاذ تھا مثلاً ۲ فیصد استعمال ہوتا تھا" تو "جدید عربي میں پہلا لفظ ترک کر دیا گیا اور دوسرا لفظ رائج کر دیا گیا۔ جس کے نتیجے میں آج جدید عربي میں ۹۸ فیصد والا لفظ ۲ فیصد والا بن گیا اور ۲ فیصد والا لفظ ۹۸ فیصد والا بن گیا"۔ (کتاب مؤلف، ص:۲۵۵)۔

پھر اخیر میں مسلم کی جو حدیث مرفوع پیش کی گئی ہے۔ اسی مضمون سے کچھ ملتی جلتی۔ اس میں بھی "أي آية" ہے "أية آية" نہیں ہے اس سے بھی تقویت مؤلف کے موقف کو ہی ملتی ہے کہ صحیح اور فصیح مذکر مونث دونوں کے لیے "أي" ہے۔ نہ کہ "أية"۔

**ساتویں مثال**: ساجد صباح الخیر: اسلام میں سلام ہے اور زمانہ جاہلیت میں "عم صباحاً" کہتے تھے لیکن جدید عربي والوں نے انگریزی کے لفظ "good morning" کے لفظی ترجمے میں "صباح الخير" کو رائج کر دیا؛ حالانکہ یہ فرنگی محاورہ ہے۔ اس سے اجتناب کرنا ضروری ہے۔ علامہ بکر بن عبداللہ فرماتے ہیں: هذه التحية هي التحية المجوسية. (کتاب مؤلف، ص:۴۷۵۔ بحوالہ: لسان غصن لبنان، لشاكر أفندي شقير اللبناني، ص:۷. وأثر اللغات الإفرنجية في العربية العصرية، لمحمد خليل الزروق، ص:۲. ومعجم المناهي

اللفظية، لبكر بن عبد الله أبي زيد، ص: ٣٣٤، و ٥٧٦).

**تبصرہ:** صباح الخیر کا استعمال السلام علیکم و رحمۃ اللہ و بر کاتہ کے بعد ہی کیا جاتا ہے۔ کسی ادیب اور کسی اکیڈمی نے صباح الخیر کو السلام علیکم کا متبادل نہیں کہا ہے۔ یہ بات افتراء محض ہے۔ (نوری جائزہ: ۱۴/۳)۔

**تبصرہ بر تبصرہ:** اگر یہ بات صحیح بھی ہو کہ "صباح الخیر کا استعمال السلام علیکم و رحمۃ اللہ و بر کاتہ کے بعد ہی کیا جاتا ہے" تو بھی اس فرنگی محاورہ اور مجوسی سلام سے اجتناب کرنا ضروری ہے؛ کیونکہ یہ فرنگی تاثر کی ابتدا ہے کہ دو دو سلام کا بوجھ اٹھایا جا رہا ہے؛ لیکن فرنگیت کا زہریلا اثر جس تیزی سے بدن عربی میں سرایت کر رہا ہے اس کو دیکھتے ہوئے وہ دن زیادہ دور نہیں لگتا کہ عربی قوم ایک سلام یعنی اسلامی سلام سے سبک دوش ہو جائے گی اور دوسرے سلام یعنی مجوسی سلام پر ہی اکتفا کرنے لگے گی؛ لہذا اصول فقہ کے "سد باب" کے اصول کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایسی تعبیر کے رواج پر ابھی سے بند باندھنا بے حد ضروری ہے۔

**تبصرہ:** حضرت کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ نے محادثات میں عربی جملے پر توجہ مرکوز رکھی ہے۔ (۳/۱۴)۔

**تبصرہ بر تبصرہ:** یعنی آپ کے نزدیک "السلام علیکم و رحمۃ اللہ و بر کاتہ" اردو جملہ ہے۔

**تبصرہ:** سلام و جواب اور احوال و خیریت سے محادثے کو ظاہراً طول نہیں دیا ہے۔ (۱۴)۔

**تبصرہ بر تبصرہ:** اے کاش! حضرت علیہ الرحمہ اس مجوسی سلام سے بھی محادثے کو ظاہراً طول نہ دیتے۔

**تبصرہ:** اس سے یہ سمجھنا کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ سلام کی جگہ صباح الخیر کو رائج کرنا چاہتے ہیں حد درجہ بدگمانی ہے۔ (۱۴)۔

**تبصرہ بر تبصرہ:** مؤلف نے نہ ایسا کہا ہے اور نہ ہی ان کا گمان ایسا ہے؛ البتہ آپ کا

خوامخواہ میں "رائی کا پہاڑ بنانا" یہ مؤلف سے "حد درجہ بدگمانی" کا غماز ضرور ہے۔ مؤلف نے تو فقط اتنا کہا ہے کہ "یہ فرنگی محاورہ ہے اس سے اجتناب کرنا ضروری ہے"۔

باقی مؤلف نے جہاں کہیں "جدید عربي والوں" پر نزلہ گرایا ہے، تو اس کے مخاطب اصلاً جدید عربي کے سرخیل مصری ادباء ہیں۔ باقی ہمارے عجمی ادباء اور ان کی شخصیات پر اگر کچھ آنچ آتی ہے تو وہ تفریعاً اور تطبیقاً ہے، اصلاً اور مستقلاً نہیں اور یہی وجہ ہے کہ عجمی ادباء کے تعلق سے جو کچھ بات ہے، وہ کتاب کے آخری خمس میں ہے، اور یہ آخری خمس ماقبل کے چار اخماس پر متفرع ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ مؤلف نے کتاب میں ہمارے عجمی ادباء کے تعلق سے کچھ لکھنے سے پہلے ان کے بارے میں اپنا "مبنی بر اعتدال موقف" بھی پیش کرنا ضروری سمجھا؛ تاکہ جدید عربي کے اصل اور مستقل مخاطبین اور فرعی و تطبیقی مخاطبین ممتاز اور الگ ہوجائیں۔ اور تاکہ قدیم عربي اور قرآن و حدیث کی عربي کو پامال کرنے والے اصل مجرمین اور گنہگاروں کی صف سے ہمارے بڑوں کو بحسن و خوبی نکال لے جایا جائے۔ چنانچہ وہ صفحہ ۴۳۵ پر رقم طراز ہیں کہ « ہمارے عجم کے ادباء... نے نہ تو اپنی طرف سے کسی غلطی کو ایجاد کیا ہے، اور نہ اپنی طرف سے کسی فرنگی ترکیب کو گھڑا ہے؛ بلکہ ان حضرات نے عربوں سے حسن ظن کی بنا پر ہر فرنگی ترکیب اور ہر لسانی غلطی کو قبول کیا۔ پھر یہ غلطیاں ان کی تحریروں کے ذریعے بر صغیر کے مدارس میں عام ہوگئیں۔ اللہ تعالی ان حضرات کو ان کے حسن نیت کا ثواب ضرور عطا فرمائیں گے، البتہ ہم خُردوں پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ ان حضرات کی کتابوں اور تحریروں سے جو فرنگی عربي اور لسانی تحریفات اور غلطیاں پھیل گئی ہیں ہم ان سے آگاہی حاصل کریں اور دوسروں کو بھی ان سے آگاہ کرنے کی سعی اور کوشش کریں"۔ (کتاب مؤلف، ص: ۴۳۵)۔

**آٹھویں مثال**: فأكلت الأسرة: "أسرة" کی تعبیر پر مؤلف کا نقد، اس پر تبصرہ نگار کا تبصرہ اور راقم کا تبصرہ بر تبصرہ جائزہ کی قسط اول میں گزر چکا ہے۔

**نویں مثال**: هذان تفاحان... كل هذين التفاحين: یہاں دو عدد سیب مراد ہیں اس لیے "تفاحان" غلط ہے؛ بلکہ "تفاحتان/التفاحتين" لکھنا ضروری ہے۔ اسی طرح ....: ورق،

ورقان، ثلاثةأوراق، عشرةأوراق، أحدعشر ورقاً. . . إلى ألف ورق:ایک سے ایک ہزار کی یہ ساری گنتیاں بالکل غلط ہیں ؛کیونکہ افراد کی گنتی میں مفردات کو معدود بنایا جاتا ہے، نہ کہ اسمائے اجناس کو؛ لہذا یہاں صحیح الفاظ یہ ہیں: ورقة، ورقتان، ثلاث ورقات. . عشر ورقات، إحدى عشرةورقة. . إلى ألف ورقة۔ (کتاب مؤلف، ص:۴۷۵)۔

**تبصرہ**: اسم جنس کا معاملہ اتنا سہل نہیں ہے۔ بعض متاخرین نحات کی تعیینات کو صرف ترجیحی آرا کے طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ ان کے طے شدہ اصولوں سے قدیم کلام عرب کو یا ان کے استعمال کو غلط قرار نہیں دیا جاسکتا۔ (نوری جائزہ:۳/۱۵)۔

**تبصرہ بر تبصرہ**: اسم جنس کا معاملہ آپ کے لیے سہل ہو یا نہ ہو؛؛ لیکن جس شخص کی نحو وصرف پر لکھی ہوئی کتابیں دسیوں مدارس میں داخل نصاب ہوں، اس کے لیے معاملہ سہل ہی نہیں ؛انتہائی سہل ہے۔

آپ نے جو یہ فرمایا کہ « متاخرین نحات. . کے طے شدہ اصولوں سے قدیم کلام عرب کو یا ان کے استعمال کو غلط قرار نہیں دیا جاسکتا » تو یہ تو آپ کا اخذ کردہ نتیجہ ہے کہ ''متاخرین نحات کے طے شدہ اصولوں سے قدیم کلام عرب کی تغلیط لازم آئے گی''۔ یہ تغلیط تو اس وقت لازم آتی جب قدیم کلام عرب متاخرین نحات کے اس اصول کے برخلاف ہوتا ؛حالانکہ معاملہ اس کے برعکس ہے ؛کیونکہ متاخرین نحات نے قدیم کلام عرب ہی سے تو اس اصول کو ماخوذ و مستفاد اور مستنبط کیا ہے۔ اگر قدیم کلام عرب ہی اس اصول کے برخلاف ہوتا تو متاخرین نحات اس اصول اور ضابطے کو بیان ہی نہ کرتے۔

قدیم اور اصل عربی کے باب میں قرآن کریم کی استنادی حیثیت پر کسی صاحب ایمان کو کچھ بھی کلام نہیں ہو سکتا۔ قرآن کریم میں جہاں کہیں بھی عدد معدود کا تذکرہ آیا ہے، آپ دیکھ سکتے ہیں کہ ضابطہ وہی کار فرما ہے جو مؤلف نے بیان کیا کہ « افراد کی گنتی میں مفردات کو معدود بنایا گیا ہے نہ کہ اسمائے اجناس کو''۔ چند مثالیں پیش خدمت ہیں:

(١)ثلاثة قروء (البقرة).

(٢)ثلاثة أيام في الحج (البقرة).

(٣)أربعة أشهر (التوبة).

(٤)ستة أيام (الأعراف).

(٥)سبع سماوات (الملك).

(٦)سبع بقرات (يوسف).

(٧)تسع آيات (الإسراء).

(٨)ثلاثين ليلة (الأعراف).

(٩)أربعين سنة (المائدة).

(١٠)سبعين مرة (التوبة).

(١١)ثمانين جلدة (النور).

(١٢)تسع و تسعون نعجة (ص)۔

ان تمام مثالوں میں غور کرتے جائیے۔ یہ حقیقت آشکارا ہوتی جائے گی کہ ”افراد کی گنتی میں (مفرد یا) مفردات کو معدود بنایا جاتا ہے، نہ کہ اسمائے اجناس کو“۔

**تبصرہ:** اسم جنس جمعی کو فردیت کے معنی سے خالی کرنا، بعض متاخرین نحات کا غلو ہے جس میں ابن ہشام اور دوسرے علماء بھی شامل ہیں۔ (دلیل:) قرآن کریم میں اسم جنس جمعی کی صفت مفرد بھی آئی ہے اور جمع بھی۔ . اسم جنس کا اطلاق جنس اور نوع پر بھی ہوا ہے اور فرد واحد اور فرد متعیّن پر بھی۔ قرآن کی آیت «و ھذا البلد الأمین» میں لفظ ”البلد“ اسم جنس جمعی ہے اس کا واحد تاء کے ساتھ ”بلدۃ“ قرآن کریم میں مذکور ہے۔ البلد الامین میں لفظ البلد متعیّن طریقے سے شہر مکہ کے لیے آیا ہے؛ اس لیے اسم جنس کا استعمال اگر واحد کے لیے یا فرد جنس کے لیے ہوا ہے تو وہ غلط کیسے ہو سکتا ہے؟ (نوری جائزہ: ۳/۱۵)۔

**تبصرہ برتبصرہ:** پہلی بات تو یہ کہ بلاکسی حوالہ اور دلیل کے اس مسئلہ میں متقدمین اور متاخرین نحات کی تقسیم کرنا، پھر اس میں متاخرین پر غلواور افراط کی تہمت لگانا یہ خود آپ کا غلو ہے۔

دوسری بات یہ کہ اگر آپ کو قرآن کریم کی اس آیت سے اشتباہ ہوگیا ہے جس کی بنیاد پر آپ نے متقدمین اور متاخرین نحات کی الگ الگ تقسیم کردی ہے اور متاخرین نحات پر غلو کا بہتان باندھ دیا ہے۔

توآں محترم! پہلے تو یہ گوش گذار ہو؛ بلکہ شاید سمع خراش ہو کہ "بلدۃ" اور "بلد" میں واحد اور اسم جنس کا تعلق ہے ہی نہیں؛ بلکہ دونوں مستقل الگ الگ اسماء ہیں۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ اسم جنس جمعی اور اس کے واحد میں حرکات و سکنات کا فرق نہیں ہوتا بلکہ کلی مطابقت ہوتی ہے صرف اخیر میں ایک تائے وحدت سے دونوں میں فرق ہوتا ہے جیسے شَجَرٌ و شَجَرَۃٌ/زَھْرٌ و زَھْرَۃٌ/وَرَقٌ و وَرَقَۃٌ/بَقَرٌ و بَقَرَۃٌ/وَرْدٌ و وَرْدَۃٌ/جَمْرٌ و جَمْرَۃٌ؛ لیکن "بَلَدٌ و بَلْدَۃٌ" میں دیکھیے کہ "بَلَدٌ" میں تو لام پر فتحہ ہے؛ جبکہ "بَلْدَۃٌ" میں لام پر سکون۔ پتہ چلا کہ یہ دونوں الگ الگ مستقل اسماء ہیں۔ ان میں واحد اور اسم جنس جمعی کا تعلق نہیں ہے۔ پھر اس کے اطلاق میں مختلف اقوال ہیں۔ جن میں سے ایک قول یہ بھی ہے کہ "بلدۃ" کا اطلاق شہر پر ہوتا ہے؛ جبکہ "بلد" کا اطلاق پورے ملک پر۔ (اور ملک کہتے ہیں مختلف شہروں کے مجموعہ کو؛ لہذا بلد کہیں گے مختلف بلدات کے مجموعہ کو)

باقی مکہ جو کہ بلدہ اور شہر ہے اس کو بلد اور ملک کہنا یہ تفخیم شان کے لیے ہے ملاحظہ ہو لسان العرب حرف الباء: «و البلد مکة تفخیما لھا کالنجم للثریا» یعنی یہاں پر عظمت شان کے پیش نظر البلد (یعنی: ملک) بول کر البلدۃ (یعنی: اس کا ایک شہر) مراد لیا گیا ہے۔ بلاغتی اصطلاح میں کہہ لیجیے کہ "کل بول کر جزء مراد لیا گیا ہے"۔ اسم جنس بول کر اس کا ایک فرد مراد نہیں لیا گیا ہے؛ کیوں کہ "بلد و بلدۃ" میں جنس و فرد کا تعلق ہے ہی نہیں۔ اور کل و جزء اور جنس و فرد میں فرق، منطق کے ابتدائی طلبہ کے سامنے بھی واضح ہی ہوگا (کہ کل اپنے ہر ہر جزء کے تحت مکمل نہیں پایا جاتا؛ بلکہ تمام اجزاء سے مل کر وجود پاتا ہے۔ جیسے: شربت کہ وہ چینی، پانی اور لیموں کے تحت الگ

الگ نہیں پایا جاتا؛ بلکہ ان سب سے مل کر وجود پاتا ہے؛ جبکہ جنس اپنے ہر فرد کے تحت مکمل پائی جاتی ہے، جیسے: انسانیت کہ وہ زید، عمرو، بکر میں سے ہر ایک کے تحت مکمل پائی جاتی ہے)۔

**تبصرہ**: بلکہ بعض دفعہ اسم جنس پر تاء داخل کر دیا جائے، تب بھی اس سے مراد اسم جنس ہی رہتا ہے۔ فرد واحد یا فرد متعیّن مراد نہیں ہوتا ہے۔ قرآن کریم کی ان آیتوں پر غور فرمائیں: ﴿لنحيي به بلدة ميتة و نسقيه مما خلقنا أنعاما و أناسي كثيراً)﴾ الفرقان ﴿ .(و الذي نزل من السماء ماء بقدر فأنشرنا به بلدة ميتا, كذلك تخرجون)﴾ الزخرف). ظاہر ہے کہ ان آیتوں میں "بلد" مفرد ضرور ہے؛ لیکن اسم جنس کے لیے ہے۔ کوئی متعیّن شہر مراد نہیں ہے اور نہ ہی ایک شہر مراد ہے۔ مزید تحقیق مطلوب ہو تو تفسیر کشاف کی عبارت دیکھیں: «و إنما قال ميتا لان البلدة في معنى البلد في قوله فسقناه إلى بلد ميت» اور تفسیر نسفی میں ہے: {لنحيي به} بالمطر {بلدة ميتا} ذكّر ميتا على إرادة البلد أو المكان. (تفسير النسفي)

البلدة کو البلد کے معنی میں لیا گیا ہے۔ اسی لیے مذکر صفت لائی گئی ہے۔ آیت کا سیاق بھی یہی بتا رہا ہے کہ کسی خاص شہر کی بات نہیں ہو رہی ہے؛ بلکہ عمومی بات ہو رہی ہے۔ (نوری جائزہ ۳/۱۶)۔

**تبصرہ بر تبصرہ**: آپ کے اس تبصرہ کی عمارت اس بات پر کھڑی ہے کہ "بَلَدٌ اسم جنس جمعی ہے، جس پر تائے وحدت داخل کر دینے کے باوجود بھی کبھی مراد اسم جنس ہی رہتا ہے" لیکن اس حقیقت کے واشگاف ہونے کے بعد وہ فلک بوس عمارت زمین بوس بھی ہو جاتی ہے کہ "بلدة اور بلد" میں اسم جنس جمعی اور واحد کا تعلق ہے ہی نہیں؛ بلکہ دونوں مستقل اور الگ الگ اسماء ہیں۔ بس مادہ کا اشتراک ہے۔

**تبصرہ**: اس لیے میں نے کہا کہ اسم جنس کے معاملے میں مغنی اللبیب النحو الوافی کی تحقیقات کو صرف ترجیحات کے خانے میں رکھا جا سکتا ہے یعنی یہ کہ ان تحقیقات کا لحاظ کرنا اولی اور انسب ہے؛ لیکن وہ صحیح و غلط کا معیار نہیں ہیں؛ کیونکہ قرآنی استعمال اس کے برعکس بھی ہے۔ (نوری

جائزہ۱۶،۱۷/۳)۔

**تبصرہ بر تبصرہ**: قرآنی استعمال اس کے برعکس ہونے کا شبہ آپ کو "بلدۃ اور بلد" کی حقیقت کے تعلق سے اشتباہ میں پڑ جانے سے ہوا؛ جبکہ ہم نے "حرکات میں عدم مطابقت" کی دلیل سے ثابت کر دیا ہے کہ "بلد اور بلدۃ" میں اسم جنس اور وحدت کا تعلق ہے ہی نہیں؛ لہٰذا اب آپ کے نزدیک بھی "مغنی اللبیب اور النحو الوافی" کی تحقیقات کو صرف ترجیحات کے خانے میں" نہ سجایا جانا چاہیے؛ بلکہ ان کا لحاظ کرنا اور نہ کرنا، "صحیح اور غلط کا معیار" ہونا چاہیے۔

**دسویں مثال**: لم یجد زهرة واحدة...أین ذهب الزهر؟ پہلے جملے میں "الزهرة" ہے تو دوسرے میں "الزهر" غلط ہے؛ بلکہ اس میں بھی "الزهرة" استعمال ہوگا۔ اور اگر مطلق پھول مراد ہے تو پھر عنوان "سرقة الزهر" غلط ہے؛ بلکہ صحیح عنوان "سرقة الزهر" ہوگا۔ (کتاب مؤلف، ص۴۵۸)

**تبصرہ**: اسم جنس کی بات پہلے ہو چکی ہے؛ اس لیے غلط اور صحیح کی تعبیر درست نہیں ہے۔ (نوری جائزہ۱۷/۳)۔

**تبصرہ بر تبصرہ**: اسم جنس کا موقع الگ ہے اور مفرد و مفردات کا موقع الگ ہے ایک موقع میں دوسرے کا استعمال قرآن و حدیث کے استعمال کے برخلاف ہے۔ قرآن و حدیث میں جہاں کہیں اطلاق کا موقع رہا، وہاں اسم جنس کا استعمال ہوا ہے، اور جہاں کہیں تعیین یا عدد و معدود کا موقع آیا تو وہاں مفرد یا اس کی جمع کا استعمال کیا گیا ہے۔ چند مثالیں حاضر خدمت ہیں:

(۱)﴿ کمثل حبة أنبتت سبع سنابل في كل سنبلة مائة حبة﴾ اس آیت میں ایک دانہ کی مثال دی جا رہی ہے؛ اس لیے بجائے "حب" اسم جنس کے "حبة" مفرد آیا ہے۔ اسی طرح «فی سنبلة» آیا ہے «فی سنبل» نہیں پھر "مائة" کا معدود بھی "حبة" مفرد ہے اسم جنس "حب" نہیں۔

(۲) اور ﴿ إن الله فالق الحب و النوى ﴾ اور ﴿ و الحب ذو العصف و الريحان ﴾ میں

الحب اسم جنس آیا ہے؛ اس لیے کہ یہ اطلاق اور اسم جنس کا موقع ہے۔ متعیّن اور عدد و معدود کا موقع نہیں۔

﴿(۳) إن الله يأمر كم أن تذبحوا بقرة﴾ (البقرة) ﴿إنه يقول إنها بقرة لا فارض ولا بكر﴾ (البقرة) ﴿إنها بقرة صفراء)﴾ البقرة (ان تمام جگہوں پر چونکہ ایک عدد گائے مراد ہے۔ عدد کا موقع ہے؛ اس لیے مفرد "بقرة" لایا گیا۔ اسم جنس "بقر" نہیں۔

(۴) ﴿إن البقر تشابه علينا﴾ چونکہ اطلاق کا موقع ہے۔ مطلق گائے مراد ہے؛ اس لیے اسم جنس "بقر" کا استعمال ہوا ہے۔

(۵) ﴿إني أرى سبع بقرات سمان يأكلهن سبع عجاف)﴾ يوسف) یہاں پر چونکہ عدد و معدود کا موقع ہے؛ اس لیے بجائے اسم جنس "بقر" یا اس کی جمع "ابقار" کے "بقرة" مفرد کی جمع "بقرات" کو ذکر کیا گیا۔

(٦) ﴿أتموا الصيام إلى الليل)﴾ البقرة) اطلاق کا موقع ہے؛ اس لیے اسم جنس "الليل" استعمال ہوا ہے مفرد "ليلة" نہیں۔

(۷) ﴿وٰعدنا موسى ثلٰثين ليلة﴾ عدد و معدود کا موقع ہے؛ اس لیے مفرد "ليلة" استعمال ہوا ہے اسم جنس "ليل" نہیں۔

## حدیث سے مثال:

(۱) فتوفاه وليس في رأسه ولحيته عشرون شعرة بيضاء (صحيح البخاری، رقم: ۳۵٤۸) معدود کا موقع ہے اس لیے "شعرة" مفرد لایا گیا ہے، اسم جنس "شعر" نہیں۔

(۲) يلبس النعال التي ليس فيها شعر ويتوضأ فيها) صحيح البخاری ۱/٤٤) اطلاق کا موقع ہے عدد کا نہیں؛ اس لیے "شعر" اسم جنس آیا ہے "شعرة" مفرد نہیں۔

**الحاصل**: اسم جنس کا موقع الگ ہے، اور مفرد و مفردات کا موقع الگ ہے۔ ایک کے موقع

پر دوسرے کا استعمال آپ اسے "غلط وصحیح کی تعبیر" میں لے آئیں یا اور کوئی تعبیر اپنائیں۔ بہر حال وہ قرآن وحدیث کے استعمال کے بر خلاف ہے۔

**گیارہویں مثال**: هل تأذن لي بالسفر يا أبي. . آذن لك بالسفر۔ نیز جزء ثالث ص:۱۳۰ پر آیا ہے: يأذن الشرطي بالمرور۔ حالانکہ یہ صلے کی فاش غلطی ہے؛ کیونکہ "أذن بكذا" کے معنی ہیں: جاننا، (فأذنوا بحرب من الله)۔ اور "أذن له فيه" کے معنی ہیں: اجازت دینا۔ (کتاب مؤلف ص:۴۵۸. بحوالہ: تذكرة الكاتب، ص:٥٤. و عثرات الأقلام والألسنة، ص:٢٩. والأخطاء الشائعة في استعمالات حروف الجر، ص:٥٣. ومعجم تقويم اللغة، ص:٢١. معجم الأخطاء الشائعة، ص:٣٢) خود حضرت مولانا کیرانوی صاحب نے القاموس الوحید میں لکھا ہے: "أذن به" جاننا، اور "أذن له فيه": اجازت دینا۔ (کتاب مؤلف، ص:۴۵۸)

**تبصرہ**: لیکن یہاں پر ذرا ان کتابوں کو بھی دیکھنا ضروری ہے، جو ماہر لغوی اور متخصصین نے لکھی ہیں: معجم الصواب اللغوی کی عبارت دیکھیں: . . مثال: أذن له بالسفر. الرأي: مرفوضة. السبب: لتعدية الفعل ب«الباء» وهو يتعدى ب «في». الصواب والرتبة: أذن له في السفر [فصيحة] - أذن له بالسفر [صحيحة]. التعليق: الوارد في المعاجم تعدية الفعل «أذن» ب«في»، ولكن أجاز اللغويون نيابة حروف الجر بعضها عن بعض، كما أجازوا تضمين فعل معنى فعل آخر فيتعدى تعديته، وفي المصباح (طرح): « الفعل إذا تضمن معنى فعل جاز أن يعمل عمله» وقد أقر مجمع اللغة المصري هذا وذاك، ومجيء «الباء» بدلا من «في» كثير في الاستعمال الفصيح، ومنه قوله تعالى {ولقد نصركم الله ببدر} آل عمران وقوله تعالى: {إن أول بيت وضع للناس للذي ببكة} آل عمران؛ ومن ثم يمكن تصحيح الاستعمال المرفوض كما يمكن تصحيحه أيضا بعد تضمينه معنى الفعل «سمح». (معجم الصواب اللغوي)

**تبصرہ بر تبصرہ**: "جائزۃ الجائزۃ" کی پہلی قسط میں اس کتاب کی عدم اعتباریت پر ہم کلام کر چکے ہیں کہ واقع و نفس الامری میں بھی، اور خود تبصرہ نگار کے نزدیک بھی یہ کتاب «مستعمل غلط کلمات کی اصلاح » (بمعنی تاویل) کے لیے لکھی گئی ہے۔ اس کتاب کا مقصد تالیف ہی فرنگی تعبیرات کو کھینچ تان کر صحیح اور فصیح قرار دینا ہے؛ لہذا یہ کتاب بالکل بھی ساقط الاعتبار ہے۔ اور پھر اس کتاب کی عبارت میں بھی جن لغویین اور جس مجمع اللغۃ المصری کا حوالہ دیا گیا ہے وہ قاہرہ کی مجمع اللغۃ اور اس کے اراکین ہیں جن کی عدم اعتباریت اور اس کی معقول وجہ پر مفصل کلام تیسری قسط کے شروع میں گزر چکا ہے۔

اور پھر مؤلف معجم کی یہ تاویل رکیک بھی تو دیکھیں کہ بات تو "صلہ کی فاش غلطی" کی چل رہی ہے اور مؤلف معجم تاویل میں مطلق حروف جر کو پیش کر رہے ہیں کہ « ایک حرف جر کبھی دوسرے حرف جر کے معنی میں آجاتا ہے جیسے: ﴿ولقد نصركم الله ببدر﴾ أي في بدر ﴿للذي ببكة﴾ أي في مكة» مطلق حروف جر میں ایک دوسرے کی نیابت کا کوئی منکر نہیں؛ لیکن اصول و قواعد اور قدمائے عرب کے کلام سے یہ تو ثابت کریں کہ "ایک فعل کا اصل صلہ چھوڑ کر دوسرا صلہ استعمال کرنے کی گنجائش ہے"۔

رہی صورت تضمین تو اس میں بھی کوئی اس بات کا قائل نہیں ہے کہ یہ صلہ اس فعل مذکور کا ہے؛ بلکہ جو فعل مضمر اور متضمن ہے، اسی کا صلہ مانا جاتا ہے اور متضمن ماننے کی وجہ بھی فقط یہی ہے کہ فعل کے صلات کو بدلنا لغتاً انتہائی غلط ہے؛ اس لیے اس صلہ کا اصل فعل متضمن مان لیا جاتا ہے؛ لیکن "أذن بكذا" میں تضمین کی صورت ہے ہی نہیں؛ کیونکہ مؤلف معجم بھی کہہ رہے ہیں: «أذن له بالسفر مرفوضة لتعدية الفعل بالباء وهو يتعدى بفي» یعنی أذن له بالسفر متروک ہے؛ اس لیے کہ فعل کا صلہ "باء" لایا گیا ہے جبکہ اس کا صلہ "فی" آتا ہے۔

اسی طرح ان کی اخیر میں یہ عبارت: «ومن ثم يمكن تصحيح الاستعمال المرفوض كما يمكن تصحيحه أيضا بعد تضمينه معنى الفعل "سمح"» (کہ جس طرح فعل سمح

متضمن مان کر ''أذن بكذا'' کی تعبیر درست ہو سکتی ہے اسی طرح (بدون تضمین باء صلہ لاکر) اس متروک استعمال کی تصحیح بھی ممکن ہے) ملاحظہ کریں کہ اصل اختلاف صورت تضمین میں ہے ہی نہیں؛ بلکہ بدون تضمین اس کا صلہ باء لانے میں ہے جو مؤلف معجم کے نزدیک بھی اصلاً تو متروک ہے؛ لیکن وہ تاویلات باردہ کے ذریعے اس کے استعمال کو صحیح قرار دینے پر تُلے ہیں جو اصول وقواعد کے بھی خلاف ہے اور قدمائے عرب کے کلام سے بھی متصادم اور اس کے معارض ہے۔

**بارہویں مثال**: القراءة الواضحة جزء ثالث ص ۸۷ پر لکھا ہے: «البقال يزودكم بالسكر والرز والزيت والملح والصابون والزبدة والجبن».. جبکہ القراءة الواضحة جزء اول، ص ۴۳ پر لکھا ہے: «البقال يبيع الخضرة» سوال یہ ہے کہ بقال کسے کہتے ہیں اور وہ کیا بیچتا ہے۔ دراصل ''بقال'' بقل کا فاعل ذی کذا ہے یعنی سبزی والا، ترکاری والا۔ مصری عامی زبان میں پرچون فروش کو ''بقال'' کہتے ہیں اسی عامی زبان سے جدید عربی میں یہ بقال رائج کر دیا گیا جو لغتاً غلط ہے؛ لہٰذا القراءۃ الواضحہ ثانی اور ثالث کی بات (پرچون فروش) غلط ہے اور جزء اول کی بات (سبزی فروش) صحیح ہے۔ (کتاب مؤلف، ص:۴۵۹)۔

**تبصرہ**: البقال کیا بیچتا ہے؟ یہ سوال غامدی صاحب سے کرنا چاہیے؛ کیونکہ البقالۃ وہیں ہوتا ہے۔ وہاں کسی بقالے کی دکان میں داخل ہوتے ہی یہ سوال بالکل ختم ہو جائے گا کہ البقال کیا بیچتا ہے؟ البقال وہ تمام چیزیں بیچتا ہے جن کا ذکر کتاب میں ہے۔ (نوری جائزہ:۱۸/۳)۔

**تبصرہ بر تبصرہ**: البقّال (سبزی فروش) وہ تمام چیزیں نہیں بیچتا جن کا ذکر کتاب میں ہے یعنی چینی، چاول، تیل، نمک، صابن وغیرہ؛ بلکہ وہ تمام چیزیں بیچنے والے کو جدید عربی میں بقّال کہا جا رہا ہے جو کہ لغتاً غلط ہے اور صحیح لغت بدّال (پرچون فروش) ہے۔

**تیرہویں مثال**: ''ربيع الثاني'' لکھنا غلط ہے؛ بلکہ صحیح لفظ ''ربيع الآخر'' ہے۔ (کتاب مؤلف ص ۴۵۹۔ بحوالہ: نحو إتقان الكتابة باللغة العربية، ص:۱۱۰. وأزاهير الفصحى في دقائق اللغة، ص: ۵۹. ومعجم المنتقى من الخطأ والصواب، ص:۱۴، و۷۵،

و٨٦. والأخطاء اللغة العربية المعاصرة، ص:١٣١. ونحو وعي إسلامي لمازن المبارك، ص:١٩٧. وجامع العدد والتاريخ، ص:١٦٨,و١٧٧,و١٧٨).

**تبصرہ**: ربیع کے ساتھ الثانی کا استعمال قدیم ہے۔ اکثر معاجم میں یہ عبارت مذکور ہے۔

«والربيع الثاني وهو الفصل الذي تدرك فيه الثمار» (الصحاح)

**تبصرہ بر تبصرہ**: آپ نے "الصحاح" کی جو عبارت پیش کی ہے، وہ تو الٹا آپ ہی کے برخلاف ہے۔ کاش! آپ یہاں پر بھی ذرا آگے پیچھے کی عبارت میں خوض کر لیتے تو شاید اعتراض کی نوبت نہ آتی۔ "الصحاح" کی پوری عبارت ملاحظہ کریں: والربيع عند العرب ربيعان : ربيع الشهور وربيع الأزمنة۔ فربيع الشهور: شهران بعد صفر ولا يقال فيه إلا شهر ربيعٍ الأول وشهر ربيعٍ الآخر. وأما ربيع الأزمنة: فربيعان: الربيع الأول: هو الفصل الذي تأتي فيه الكمأة والنور وهو الربيع الكلأ. والربيع الثاني: وهو الفصل الذي تدرك فيه الثمار في الناس. (الصحاح).

اس عبارت کے اندر دیکھیں کہ "عربوں کے نزدیک ربیع کی دو قسمیں ہیں: ایک ہے مہینوں کا ربیع اور دوسرا ہے زمانوں (موسموں) کا ربیع۔ مہینوں کا ربیع دو مہینے ہیں جو صفر کے بعد ہیں۔ ان کو صرف یہی کہا جا سکتا ہے "ربیعِ الأول، ربیعِ الآخر" اور رہا زمانوں (موسموں) کا ربیع: تو وہ بھی دو ہیں: الربیع الاول (پہلا ربیع): یہ وہ موسم ہے جس میں کھمبی اور درختوں پر کلیاں آتی ہیں اور یہ ربیع الکلا ہے۔ الربیع الثانی (دوسرا ربیع): اور یہ وہ موسم ہے جس میں پھل پک جاتے ہیں۔

حاصل یہ کی آپ نے جو الربیع الثانی والی عبارت ذکر کی ہے وہ مہینوں کا ربیع ہے ہی نہیں وہ تو موسموں کا ربیع ہے یعنی موسم بہار جو خریف یعنی موسم خزاں کے مقابلے میں بولا جاتا ہے اور جو مہینوں کا ربیع ہے اس کے بارے میں "الصحاح" میں حصر کے ساتھ یہ عبارت مذکور ہے کہ اس کو ربیعِ الأول اور ربیعِ الآخر ہی کہا جاتا ہے۔ ربیعِ الثانی نہیں۔

ع میں الزام ان کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

**چودہویں مثال**: أجب علی سؤالي اور (ص:۱۷) پر لکھا ہے: خالد یجیب علی کل سؤال نیز القراءۃ الواضحۃ جزء ثالث ص:۱۹ پر لکھا ہے: ثم أجب علی کل منها اور صفحہ ۲۵ پر لکھا ہے: وأجب علیها اور یہ تمام عبارتیں غلط ہیں کیونکہ فعل أجاب کے بعد "عن" صلہ آتا ہے، نہ کہ "علی" ڈاکٹر تقی الدین الھلالی نے لکھا ہے: وهؤلاء الکتاب الذین یستعملون (علی) بعد "أجاب" جاهلون بالنحو۔ (کتاب مؤلف ص:۴۵۹. بحوالہ: تقویم اللسانین، ص:٤٥. وتذکرہ الکاتب، ص:٣٢. وقل ولا تقل، ص:١/٦٨. وأخطاء لغویة شائعة، ص:١٩. وأزاهیر الفصحی في دقائق اللغة، ص:١٢٠. والأخطاء الشائعة فی استعمالات حروف الجر، ص:٥٩. وتطهیر اللغة من الأخطاء الشائعة، ص:٥٢، و٩٨. ومعجم تقویم اللغة، ص:٥٩)

**تبصرہ**: اس تعبیر کو مجمع اللغہ قاہرہ نے منظوری دے دی ہے اور کثرت استعمال فصحا کی بنیاد پر دی ہے۔ معجم الصواب اللغوی کی عبارت ملاحظہ ہو: مثال: أجاب علی السؤال. الرأي: مرفوضة السبب: لأن الفعل «أجاب» لا یتعدی ب« علی» الصواب والرتبة: أجاب عن السؤال [فصیحة] أجاب علی السؤال [صحیحة] (معجم الصواب اللغوي)

**تبصرہ بر تبصرہ**: مجمع اللغہ قاہرہ اور معجم الصواب اللغوی کی عدم اعتباریت پر کلام مکرر سہ کرر گذر چکا۔ باقی مجمع اللغۃ قاہرہ نے کثرت استعمال فصحا کی بنیاد پر منظوری دی ہے اس پر آپ نے کوئی دلیل ذکر نہیں کی۔ رہی معجم الصواب اللغوی کی عبارت تو اس کے اندر بھی اس پر دال کوئی لفظ و عبارت نہیں؛ بلکہ مؤلف معجم تو الٹا "مرفوض" کہہ رہے ہیں جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ قدمائے عرب کے کلام میں اور قدیم عربي میں یہ ہے ہی نہیں؛ بلکہ اس کے برخلاف ہے۔

اور بالفرض والتسلیم اگر مجمع اللغۃ قاہرہ نے منظوری کثرت استعمال فصحا کی بنیاد پر دی ہے تو مجمع کی نظر میں قابل اعتبار فصحا ہیں کون؟ قدمائے عرب اور قدیم عربي کے عشاق تو ہیں نہیں؛ کیونکہ مجمع کے مستشرق اراکین انہیں فصحا مانتے ہی نہیں۔ لامحالہ یہ "فصحا" انہی کے گرویدہ اور مقلدین ہی ہیں جو

جان بوجھ کر ان کی رائج کردہ تعبیرات کو استعمال کرتے ہیں اور خوب پھیلاتے ہیں۔ پھر مجمع کو بھی کثرت استعمال کا ایک بہانہ ہاتھ آجاتا ہے اور وہ اسے منظوری دے دیتی ہے۔

چت بھی اس کی، اور پٹ بھی اس کی

**پندرہویں مثال**: «فقالت له: صحيح أني لست بسليم» "سليم" غلط ہے "بسليمة" بصیغۂ مونث لکھنا واجب ہے۔ (کتاب مؤلف، ص:۴۶۰)۔

**تبصرہ**: فعیل کے وزن پر آنے والی صفت مشبہ میں مذکر اور مونث دونوں برابر ہوتے ہیں مثال پیش ہے: إن رحمة الله قريب من المحسنين۔ (نوری جائزہ ۳/۲۰)۔

**تبصرہ بر تبصرہ**: افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ فعیل کے بارے میں آپ کی معلومات ناقص اور ادھوری ہیں۔ فعیل کے بارے میں پوری تفصیل یہ ہے کہ:

فعیل اگر "مفعول" کے معنی میں ہو تو اس میں مذکر و مونث دونوں برابر ہوتے ہیں جیسے رجل قتيل و جريح و طريد اور امرأة قتيل و جريح و طريد، لیکن اگر فعیل "فاعل" کے معنی میں ہو تو اس میں مذکر و مونث دونوں برابر نہیں ہوتے؛ بلکہ مؤنث کے لیے تاء بڑھائی جاتی ہے جیسے: رجل جميل و بخيل و قريب۔ امرأة جميلة و بخيلة و قريبة.

عام قیاسی ضابطہ تو یہی ہے؛ لیکن کبھی کبھی سماعاً فعیل بمعنی مفعول فعیل بمنی فاعل کے مشابہ ہوتا ہے اور لحوق تاء میں اسی کا حکم لے لیتا ہے، جیسے :خصلة حميدة و صفة ذميمة: أي محمودة و مذمومة.

اور فعیل بمعنی فاعل کبھی فعیل بمعنی مفعول کے مشابہ ہوتا ہے اور عدم لحوق تاء میں اس کا حکم لے لیتا ہے، جیسے : إن رحمة الله قريب من المحسنين و لعل الساعة قريب. ( تهذيب النحو، ص:۳۵)۔

اس پوری تفصیل کو سامنے رکھیں تو محترم تبصرہ نگار کا اعتراض دھواں دھواں ہو جاتا ہے کیونکہ لفظ سلیم بمعنی سالم فعیل بمعنی فاعل ہے؛ لہذا بر بنائے قیاسی ضابطہ اس میں مؤنث کے لیے تاء بڑھانا

اور بصیغۂ مؤنث لکھنا واجب ہے۔ اور چونکہ یہ قیاسی ہے سماعی نہیں؛ کیونکہ قدمائے عرب کے کلام میں مؤنث کے لیے ہر جگہ بصیغہ مونث ہی آیا ہے؛ لہذا اس قیاسی ضابطے کی ہی پیروی کی جائے گی اس قیاس کے بر خلاف کرنا جائز نہ ہو گا۔

## القراءۃ الواضحۃ جزء ثالث

**تبصرہ**: القراءۃ الواضحۃ جزء ثالث میں تعبیرات کو عرنگی اور فرنگی دکھلایا گیا ہے۔ پہلے ہی یہ بات آچکی ہے کہ یہ سب تعبیرات درست اور صحیح ہیں۔ احداث اور تولید کے اصولوں کے مطابق ہی یہ تعبیرات زبان کا حصہ بنی ہیں اور یہ ایک فطری اور ارتقائی عمل ہے اس بنیاد پر انگریزی یا فرانسیسی تعبیر کہنا غلط ہے اور اصطلاحات سے ناواقفیت ہے اور نقد لغوی کے متشدد رجحان کی غیر ضروری تقلید ہے۔ (نوری جائزہ: ۳/۲۰)۔

**تبصرہ بر تبصرہ**: آپ کے ذکر کردہ اصول تولید و احداث کا خلاصہ محض ”نحوی و صرفی اور کچھ بلاغتی قواعد کی پاسداری“ ہے باقی دخیلہ تعبیرات و تراکیب اصلاً کس زبان کی ہیں؟ اور عربی زبان کے مزاج سے ہم آہنگ ہیں کہ نہیں؟ اس کے تعلق سے آپ یہاں تساہل اور نرمی ہے اور اس کو قبول کر لینے کی گنجائش ہے۔

آپ ہی بتائیں کہ اگر احداث و تولید کے انہی مختصر اصولوں کی مطابقت کے بعد ان تعبیرات کو انگریزی یا فرانسیسی تعبیر کہہ دینا غلط ٹھہرے تو پھر اگر احداث و تولید کے اصولوں کی مطابقت کر کے اردو کی تعبیرات کو عربی کا جامہ پہنا دیا جائے اور عربوں میں رائج کر دیا جائے؛ چنانچہ تم لوگ مار کھاؤ گے کے لیے «أنتم تاكلون الضرب» اور میں نے غصہ کو پی لیا کے لیے «أنا شربت الغضب» اور زید شرم کے مارے پانی پانی ہو گیا کے لیے «صار زيد ماء ماء من ضرب الخجل» وغیرہ اردو نما عربی تعبیرات استعمال کی جانے لگیں اور اس کو شائع و ذائع کر دیا جائے تو کیا محض تولید و احداث کے اصولوں کی پاسداری کی وجہ سے اسے فصیح عربی تعبیرات قرار دیا جا سکتا ہے؟ اور اس بنیاد پر اسے

اردو تعبیر کہہ دینا غلط ٹھہرایا جاسکتا ہے؟ **حاشا و کلا**۔ تو جس طرح اس اردو نما عربی کو آپ عربی تعبیر نہیں کہہ سکتے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ آپ کو انگریزی اور فرانسیسی نما عربی کو عربی؛ بلکہ فصیح عربی کہنے پر اصرار اور شدید اصرار ہے؟؟؟

**تبصرہ**: تسامحات کے سوا ایک بھی تعبیر القراءۃ الواضحۃ کی غلط نہیں ہے۔ (نوری جائزہ:۲۰/۳)۔

**تبصرہ بر تبصرہ**: **هذا كلام ينقض آخرُه أولَه**؛ حالانکہ عاقل کے کلام میں تناقص نہیں ہوتا۔

حضور والا! اگر یہ ساری اغلاط تسامح ہی تھیں تو آپ کو ''سہو کاتب'' کے مقامات کی طرح تسامح کے مقامات پر بھی بس ایک لفظ ''تسامح'' کہہ دینا کافی تھا آپ کو اغلاط کی کھینچ تان کر تصویب (بمعنی تاویل) کے لیے اتنے صفحات سیاہ کیوں کرنے پڑے؟

جہاں ''سہو کاتب'' کی تاویل چل سکتی تھی وہاں تو آپ نے آگے کچھ بھی نہیں لکھا تو مقام تسامحات پر اتنا کچھ لکھنے کی ضرورت کیوں کر آپڑی؟ کیا «**يدرس النحو والصرف كموضوع مستقل**» میں ''**كاف** دخیلہ استعماریہ'' تسامحاً بڑھ گیا ہے؟ «**يكلف المعلم التلميذ بقراءة درس**» میں ''**باء**'' صلہ لانا تسامح کا نتیجہ ہے؟ «**فإذا تأكد من فهم التلميذ**» میں ''**من**'' کا اضافہ بربنائے تسامح ہے؟ «**في جنينة حامد: شجر - ورد - زهر - بركة - سمكة**» - میں مفردات کے درمیان واوِ عاطفہ نہ لانا بھی تسامح ہی کی دین ہے؟ «**هل تأذن لي بالسفر**» میں ''**باء**'' صلہ اور «**أجب على سؤالي**» میں ''**على**'' صلہ بھی تسامح پر ہی محمول ہے؟

خود ہی لکھتا ہوں خود ہی مٹاتا ہوں
کب تھی ایسی بے خودی مجھ میں

**تبصرہ**: ایسی کتاب پر اس طرح سے تبصرہ کرکے، طے شدہ غلط مفروضے کی بنیاد پر، اس

کے اعتبار کو ختم کرنا، حد درجہ افسوسناک اور غیر علمی حرکت ہے۔ (نوری جائزہ ۳/۲۱)

**تبصرہ بر تبصرہ:** اگر تبصرہ "طے شدہ غلط مفروضے" کی بنیاد پر کرنا ہوتا، تو اس کے لیے پانچ صفحات؛ بلکہ پانچ سطریں ہی کافی ہوجاتیں۔ مؤلف کو اس کے لیے ساڑھے پانچ سو صفحات رقم نہ کرنے پڑتے۔

باقی، دلائل کی روشنی میں صحیح اور غلط کی نشاندہی اگر غیر علمی حرکت ہے تو پھر اسلاف کا اپنے اسلاف پر استدراکات کا پورا علمی ذخیرہ بھی بے سود اور ناقابل اعتبار ٹھہرتا ہے اور آپ کی تعبیر میں "حد درجہ افسوسناک" ہونے کا مقام پاتا ہے۔

**تبصرہ:** نقد لغوی اور تصویب یا تصحیح لغوی کے میدان میں کام کرنے والے کتنے حضرات ہیں، جنہوں نے اپنی عمریں لغت کی تصحیح اور تراث کی کتابوں کی تحقیق میں صرف کردیں۔ انہوں نے ابتدائی عمر میں جن کلمات کو غلط سمجھا، یا غیر فصیح قرار دیا، بعد میں انہیں کلام عرب میں ان کلمات کی اصل مل گئی اور وہ اپنی رائے بدلنے پر مجبور ہوئے۔ اس قسم کی متعدّد تعبیرات کو جدید عربي نامی کتاب میں فرنگی یا عرنگی تعبیرات کہا گیا ہے؛ جبکہ ان کی اصل کلام عرب میں موجود ہے۔

اس تعلق سے عصر حاضر کے عظیم لغوی محقق اور نقاد ڈاکٹر محمود محمد الطناجی (متوفی ۱۹۹۹) کی کتاب «في اللغة دراسات وبحوث» کے بعض مقالات کو دیکھ لیا جائے۔

**تبصرہ بر تبصرہ:** اگر "جدید عربي نامی کتاب میں فرنگی یا عرنگی تعبیرات.. کی اصل کلام عرب میں موجود ہے" اور "اس تعلق سے.. «في اللغة والأدب دراسات وبحوث» کے بعض مقالات" میں مواد موجود ہے تو ایسی مضبوط دلیل آپ ذکر کرنا کیسے بھول گئے؟ اگر بات ایسی ہی ہوتی تو آپ جگہ جگہ اس کتاب کے حوالے سے فرنگی تعبیرات کی اصل کلام عرب میں دکھاتے پھرتے ؛لیکن آپ تو معجم الصواب اللغوی اور مجمع اللغۃ القاہرہ کے درمیان ہی بھٹکتے پھر رہے ہیں۔

معلوم ہوا کہ "کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے" اور وہ یہی کہ اس کتاب میں بھی ویسا ہی ناقابل اعتبار مواد موجودہ ہوگا جیسا معجم الصواب اللغوی میں موجود ہے کہ شاذ اقوال اور دور از کار تاویلات

رکیکہ اور باردہ کے ذریعے خواہ مخواہ کھینچ تان کر غلط کو صحیح قرار دیا گیا ہوگا اور فرنگی کو زبردستی عربی بنانے کی بے سود کوشش کی گئی ہوگی۔ اور ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں اس کی عدم اعتباریت پر بھی وہی کلام ہوتا جو خود معجم کے تعلق سے ہو چکا ہے۔ اس لیے بس تذکرہ ہی کیا گیا عبارات پیش نہیں کی گئیں۔

ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

**تبصرہ:** اس لیے تصویب اور تصحیح کا رخ وہی طبقہ ہونا چاہیے اور وہی لوگ ہونے چاہیے، جنھوں نے عربی اصولوں کو روندا ہے یا روند رہے ہیں، نہ کہ مکمل عربی زبان یا تمام ہی ادبا اور مخلصین خدام، یا تمام کتابیں، یا تمام مجامع، یا تمام صحف و مجلات۔ (نوری جائزہ ۳/۲۳)۔

**تبصرہ بر تبصرہ:** آپ کے یہاں چونکہ ''عربی اصول'' میں ایسی تحدید و تضییق ہے (یعنی محض نحوی، صرفی اور کچھ بلاغتی قواعد کی پاسداری ہے) کہ اس کے روندنے والے واقعی آٹے میں نمک کے برابر ہی ہوسکتے ہیں؛ لیکن مؤلف نے جن اصولوں کی بنا پر جدید عربی کو فرنگی کہا ہے، جس کی وضاحت ہم نے دوسری قسط اور تیسری قسطے کے شروع میں بالتفصیل کر دی ہے (یعنی اصول و قواعد کی پاسداری کے ساتھ عجمی تعبیرات و تراکیب اور عجمی قالب و سانچے سے بھی پاک ہونا اور عربی مزاج و مذاق سے ہم آہنگ ہونا) ان کو اگر مد نظر رکھیں تو آپ کو محسوس ہوگا کہ یہاں تو آوے کا آوا بگڑا ہوا ہے۔ اور:

ایک دو زخم نہیں، جسم ہے سارا چھلنی
درد بے چارہ پریشاں ہے کہاں سے اٹھے

## حرف آخر

ردو تنقید کا مضمون ایسی وادی ہے جہاں پر پھول کم کانٹے زیادہ اگتے ہیں؛ اس لیے ایسے مضمون میں ''صلح کل'' کا لہجہ، اور حضرت تھانوی علیہ الرحمہ کی تعبیر میں ''مروجہ خوش اخلاقی'' اور ''ہر دل

عزیزی" کو برقرار رکھنا ذرا مشکل ہو جاتا ہے۔ آخر کار کچھ مقامات ایسے آ ہی جاتے ہیں جہاں قلم کو بار بار سنبھالنے کے باوجود بھی، وہ محض موزوں ردو تنقید کے پیش نظر، کوئی نہ کوئی فقرہ یا شعر چست کر ہی جاتا ہے۔ بطور خاص اس وقت جب مد مقابل کی طنز و تعریض کا جواب دینا ہو تو وہاں پر تو «تلک بتلک» اور « جیسے کو تیسا » کے اصول پر ہی عمل کرنا پڑتا ہے۔ سوان اعذار مذکورہ کے پیش نظر، راقم اپنی قلمی شوخیوں اور ادبی گستاخیوں پر محترم تبصرہ نگار سے معذرت خواہ ہے۔

کچھ تو مجبوریاں رہی ہوں گی
یوں ہی کوئی بے وفا نہیں ہوتا

والسلام علی خیر الختام
وما علینا الا البلاغ
وإن أريد إلا الإصلاح ما استطعت
وما توفيقي الا بالله
عليه توكلت وإليه أنيب.